

حقوق الرواجین

سیر ابوالاعلیٰ مودودی

حقوق الزوجین

جس میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد، نکاح و طلاق کے مسائل اور یورپ کے قوانین طلاق و فسخ و تفریق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن

لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

حسین فاروق مودودی

ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ - لاہور

ایچ فاروق ایبوس ایٹیس ایٹنڈ۔ لاہور

طابع:

ناشر:

مطبع:

اشاعت:

۱۶۵۰۰

۱۹۴۳ تا ۱۹۶۶ء

پہلی تا گیارھویں

۲۰۰۰

نومبر ۱۹۶۹ء

بارھویں

۱۰۰۰

جون ۱۹۷۱ء

تیرھویں

۱۰۰۰

نومبر ۱۹۷۲ء

چودھویں

۳۰۰۰

جون ۱۹۷۴ء

پندرھویں

۵۰۰۰

مارچ ۱۹۷۶ء

سولہویں

۲۵۰۰

جولائی ۱۹۷۹ء

سترھویں

۲,۰۰۰

اگست ۱۹۸۱ء

اٹھارھویں

۲,۰۰۰

نومبر ۱۹۸۲ء

انیسویں

۱۱/- روپے

قیمت

فہرست مضامین

۳۸	ضرر اور تعدی	۵	دیباچہ طبع اول
۴۰	ازواج میں عدل نہ کرنا	۷	دیباچہ طبع چہارم
۴۲	مرد کے حقوق	۹	مقدمہ
۴۲	(۱) حفظ اللغیب	۱۷	قانون ازدواج کے مقاصد
۴۳	(۲) شوہر کی اطاعت	۲۱	مودت و رحمت
۴۴	مرد کے اختیارات	۲۳	غیر مسلموں ازدواجی تعلق کی قباحت
۴۵	(۱) نصیحت، تادیب اور تعزیر	۲۶	مسئلہ کفادت
۴۸	(۲) طلاق	۲۹	اصول قانون
۵۰	۲- اصل دوم	۲۹	۱- اصل اول
۵۱	(۱) طلاق اور اس کی شرائط	۳۰	مرد کے فرائض
۵۸	(۲) خلع	۳۱	(۱) مہر
۶۳	صدر اول کے نظام اور باب خلع	۳۳	(۲) نفقہ
۶۷	احکام خلع	۳۴	(۳) ظلم سے اجتناب
۷۱	مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی	۳۵	ایضاً

۱۱۹	(۵) مہر	۷۲	مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات
۱۲۳	(۶) نفقہ	۷۹	(۳) قضاء شرعی
۱۲۶	(۷) ستم ناروا	۸۱	قضاء شرعی کے متعلق چند اصولی مباحث
۱۲۷	(۸) تحکیم	۸۱	قضاء کے لیے اولین شرط
۱۲۸	(۹) عیوب میں خیارِ فسخ	۸۲	قضاء کے لیے اجتہاد کی ضرورت
۱۳۱	(۱۰) عین مجبوت وغیرہ	۸۲	ہندوستان میں قضاء شرعی نہ ہونے کے نقصانات
۱۳۵	(۱۱) جنون	۸۶	اصلاح کی راہ میں پہلا قدم
۱۳۸	(۱۲) مفقود النجر	۸۸	ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت
۱۴۲	(۱۳) مذہب مالکی کے احکام میں ریاب مفقود	۹۷	اصولی ہدایات
۱۴۶	(۱۴) حکم بصورت واپسی مفقود	۱۰۷	مسائل جزئیہ
۱۴۷	(۱۵) لعان	۱۰۷	(۱) ارتداد احد الزوجین
۱۵۰	(۱۶) تطبیقات ثلاثہ در مجلس واحد	۱۱۰	(۲) خیار بلوغ
۱۵۳	خاتمہ کلام	۱۱۲	(۳) ولایت اجبار
۱۵۶	ضمیمہ ۱۔ ایک نہایت اہم استفتاء	۱۱۸	(۴) خیار بلوغ کی شرائط
۱۷۱	۲۔ یورپ کے قوانین طلاق و تفریق		

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ طبع اول

۳۳-۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ جیدر آباد دکن، بھوپال اور برطانوی ہند میں یہ مسئلہ بہت زور شور کے ساتھ اٹھانٹھا کہ مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو خرابیاں رائج الوقت قانون کے تقاضوں کی ذبحہ سے پیدا ہو رہی ہیں، ان کو دور کرنے اور شرع اسلامی کے احکام کو صحیح طور پر نافذ کرنے کے لیے کوئی نتیجہ خیز سعی ہونی چاہیے چنانچہ اس سلسلے میں بہت سے مسودات قانون ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مرتب کیے گئے اور کئی سال تک ان کی بازگشت سنبھ جاتی رہی۔ اس زمانے میں مجھے محسوس ہوا کہ اس مسئلے کے بہت سے پہلو اور نہایت اہم پہلو ایسے ہیں جن پر کا حقہ توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں نے ^{۱۳۶۴ھ} _{۱۹۳۵ء} میں حقوق الزوجین کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ مضامین "ترجمان القرآن" میں لکھا اور اس میں اسلام کے قانون ازدواج کی روح اور اس کے اصول کی وضاحت کرنے کے ساتھ ان احکام کی تشریح کی جو معاملات زن و شوہر کی اصلاح کے لیے ہم کو قرآن و حدیث میں ملتے ہیں اور چنانچہ ایسی تجاویز پیش کیں جن سے مسلمانوں کی موجودہ تازنی مشکلات صحیح طریقہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ یہ سلسلہ اصل میں نو علماء کرام کی توجہ منغلقت، کیانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ مگر اس میں بہت سے ایسے مباحث بھی آگئے تھے جن کا مطالعہ عام ناظرین کے لیے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جن لوگوں نے

میری کتاب "پردہ" ملاحظہ فرمائی ہے وہ خود بخود اس کی ضرورت محسوس کرتے
 محضے کہ تعلقات زن و مرد کو منضبط کرنے کے لیے اسلام نے جو قوانین مقرر
 کیے ہیں ان سے واقفیت حاصل کریں۔ تاکہ اس دین کا پورا نظام معاشرت
 ان کی سمجھ میں آسکے۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے اب اس سلسلہ مضامین
 کو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۲۸، صفر ۱۳۶۲ھ (۵، مارچ ۱۹۴۳ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ طبع چہارم

سترہ سال ہوئے کہ یہ کتاب ایک مسلسل مضمون کی شکل میں شائع کی گئی تھی اور دس سال سے یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ اگرچہ اول روز ہی اس میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ فقہ حنفی کے ازدواجی ہنہا بطلے میں جو اصلاحات اس کے اندر تجویز کی گئی ہیں، ان کی حیثیت فتوے کی نہیں بلکہ تجاویز کی ہے جو علماء کے سامنے اس غرض کے لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ اگر وہ ان کو شرعی اور عقلمانی دلائل کے لحاظ سے درست پائیں تو ان کے مطابق فتوے یہی تبدیل کر دیئے لیکن اس کے باوجود اس کی اشاعت کے پہلے روز سے آج تک نہ تو اس کی تجاویز پر سنجیدہ غور کیا گیا اور نہ کسی نے علمی تنقید کی تکلیف اٹھائی۔ البتہ اسے میرے خلافتِ فقہیہ پر پانچوں نے کاذرعیہ پہلے بھی بنایا گیا تھا اور اب بھی بنایا جا رہا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ اَلْمَشْتٰكِلُ

اب نظر ثانی کے موقع پر بہت سی جزئی اصلاحات کیے ساتھ میں نے اس کی دو بحثوں کو نسبتاً زیادہ مدلل کر دیا ہے جن کے دلائل پہلے زیادہ قوت کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے تھے۔ ایک ایلام کی بحث دوسرے ولایتِ اجبار کی بحث۔ باقی کسی چیز میں مخالفین کی طعنہ زنیوں کے باوجود میں نے کسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ابوالاعلیٰ ۷ ارمنستان ۱۰۰۰ ۱۱ جون ۱۹۵۲ء

مقدمہ

ہر سوسائٹی کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا جامع قانون جو اس کے مخصوص طرز تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو۔ دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیکاً ٹھیک اسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو جس میں وہ وضع کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہوا ایک قانون ضرور موجود ہے، جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ مگر یہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون اُن کے تمدنی معاملات پر فرمانروائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے۔ اور اگر کسی حد تک اسلامی ہے بھی تو ابھورامسلمان اس وقت جس نظام حکومت کے تابع ہیں اس نے عملاً ان کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیئے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے۔

دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔ مگر عملاً اس شعبہ میں بھی تشریح اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ ”محمد ن لا“ کے نام سے جس قانون کو اس شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں تشریح اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جاسکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵۰ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ کیونکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصے میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ سچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں موثر ہوں گے۔ اگر جو ان ہے تو خود اس کو ایک شریک زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک بہو بیٹے اور بیٹی و اماں کے تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانون ازدواج ایک ایسا قانون ہے جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام

یہ اس قانون کی اسی حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدریس نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی اور مسلمانوں کو ازدواجی معاملات میں اپنے دین سے ایک ایسا صالح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے قوانین ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔ مگر شومی قسمت سے یہ قانون بھی "محمدن لا" کی جھپٹ میں آگیا اور اس بڑی طرح مسخ ہوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانون ازدواج میں ایک بہت بڑی رکی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شرح اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ ہے وہ نہ صالح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا برا اثر ڈالا ہے کہ شاید کسی دوسرے قانون نے نہیں ڈالا۔ مشکل ہی سے ہندوستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مل سکے گا جس میں اس ناقص قانون کی بدلت کوئی زندگی تباہ نہ ہوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر بھی ایک امر حقیر ہے۔ اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و ناموس کو تباہ کیا۔ ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا۔ اور جو گھرانے کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے، ان میں بھی فواحش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

قانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا

ہوئیں ان پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہوا۔

ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے

قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ

آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں۔ تفصیلات تو درکنار اس کے اصول تک کو جاننے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملاتِ نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں، اسلامی قانون ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام بہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطور خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔

رہی دو بہری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور رسمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانون ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے

لے مثالی کے طور پر یہ بہالت ہی کا کرشمہ ہے کہ مسلمان بالعموم طلاق دینے کے صرف ایک ہی طریقہ سے واقف ہیں اور وہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں سے ڈالی جائیں۔ حتیٰ کہ طلاق کی دستاویز لکھنے والے بھی جب لکھتے ہیں، تین ہی طلاق لکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں یہ بدعت اور سخت گناہ ہے۔ اس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ایک طلاق دینے سے وہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے تین طلاقیں دی جاتی ہیں، اور اس صورت میں عدت کے اندر رجوع کرنے اور عدت گزار جانے پر دوبارہ نکاح کر لینے کا موقع بھی باقی رہتا ہے، تو کتنے ہی گھرتیاہ ہونے سے اور کتنے ہی بندگانِ خدا جھوٹ اور حیلہ بازیوں اور دوسری متانوں شکنیوں سے بچ جاتے۔

خلاف ہیں، بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصور ہی ان کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں ہندو تصور غالب آ گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ بیوی کو لڑائی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً نہیں تو عملاً ناقابلِ فسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر معیوب ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر احتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے خواہ درپردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لیے مہر کی مقدار اس قدر بڑھا دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی ہمت ہی نہ کر سکے، اور منافرت کی صورت میں عورت کو معلق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ ”شوہر پرستی“ عورت کے مفاد اور اخلاقی فرائض میں داخل ہو گئی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ محض سوسائٹی کی لعنتِ طامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان پر نہیں لاسکتی۔ حتیٰ کہ اگر شوہر مر جائے تب بھی اس کا اخلاقی فرض یہ ہو گیا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی رہے، کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی ہونا نہ صرف اُس کے لیے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لیے موجبِ ذلت ہے۔ دوسری طرف جو نئی نسلیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ وہ لکن مثل الذی علیہا بِالْمَعْرُوفِ لے تو بڑے زور سے کہتے ہیں، مگر لِلرِّجَالِ عَلَیْهِمْ وَرَجَعَتْ اور پرہنج کر دعتہ ان کی آواز دب جاتی ہے اور

لے عورتوں کو بھی حسنِ سلوک کا ویسا ہی حق ہے جیسا مردوں کو ان پر حاصل ہے۔

لے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ زیادہ حاصل ہے۔

اور جب الرِّجَالُ قَوُّ مَوْنِ عَلَى النِّسَاءِ کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلنا کہ کس طرح اس آیت کو قرآن سے خارج کر دیں۔ عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں اور تاویل کا انداز کہے دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو صور پھینکا ہے اس سے وہ وحشت زدہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کے دماغوں میں ان ٹھوس اور مستحکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، جن پر اسلام نے اپنے نظام معاشرت کو قائم کیا ہے۔ ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی خاندانی زندگی کو اتنا ہی بدتر کر دیا ہے جتنی وہ کسی زبانہ میں بہتر تھی۔ بے بہالت اور اجنبی تمدنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے۔ بلکہ اس کے تصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنتوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ تاوانفیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے۔ اسی لیے ایک نئے قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں زوجین کے لیے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کئے گئے

ہیں۔ ان حقوق کی حفاظت کا اور تغدی کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادرسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے اور ایسی کوئی پچیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہذا مسلمانوں کو کسی نئے قانون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کافرئس ہے کہ تقلید جہاد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانون ازدواج کو ایسی صورت میں مدون کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جاسکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنے نظام معاشرت کو ان جاہلانہ رسموں اور ان حسابی تصورات سے پاک کریں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدنوں سے اخذ کیا ہے اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں۔ پھر ایک ایسا نظام عدالت درکار ہے جو خود اس قانون پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے منصفوں کو علمی اور اخلاقی حیثیت سے وہ تربیت دی گئی ہو جو اس قانون کو دنیا کے دوسرے قوانین کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ اس کی اپنی اسپرٹ میں نافذ کریں۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر لکھا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانون ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس

قانون کے مقاصد، اصول اور احکام سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ حسب ضرورت ہم تشریح کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمہ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو۔ آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی الجھنیں کسی حد تک دوز ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ ان الجھنوں کا اصلی اور صحیح علاج صرف اسلامی حکومت اور قضائے شرعی کا پیام ہے۔ لیکن ہم محض بسبب تنزل وہ کم سے کم صورتیں بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں جن سے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی خرابیاں نسبتاً ایک صحیح شرعی طریقے سے رفع کی جاسکتی ہیں، تاکہ جو لوگ ان مسائل کے حل کی کوشش کر رہے ہیں وہ غلط سمت میں اقدام کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کریں جو کچھ شرعیّت کے مطابق ہو۔

قانونِ ازدواج کے مقاصد

قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصدِ قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کیے جاتے ہیں اور اصولوں کے ماتحت احکام دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کرے جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہو گا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہذا اہم پہلے ان مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لینے اسلام میں ازدواج کا قانون مقرر کیا گیا ہے۔

اخلاق و عفت کی حفاظت

اسلامی قانونِ ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے منابطے کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو بخش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں نکاح کو لفظِ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کا معنی قلعہ کو کہتے ہیں اور احسان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح

کرتا ہے وہ "مُحْصَن" ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ "مُحْصَنَةٌ" ہے۔ یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانونِ ازدواج کا پہلا کام اُس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گمراہ قدر چیز کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے -

وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ

ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ
مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ -

النساء - ۲۴

یہ عورتیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لیے نہیں بلکہ قیدِ نکاح میں لانے کے لیے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لیے کہتا ہے -

فَأَنْكِحُوا هُنَّ بِأَذْنِ أَهْلِهِنَّ

وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
مُحْصِنَاتٍ غَيْرَ مُسْفِحَاتٍ وَلَا

مُتَّخِذَاتٍ أَخْدَانٍ -

النساء - ۲۵

پس تم ان کے سر و سروں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو، اور مناسب طور پر ان کے ہر ادا کردہ تاکہ وہ مُحْصِنَاتٍ بنیں نہ کہ غلامیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے -

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ
أُجُورَهُنَّ مَحْصِنِينَ غَيْرِ
مُسْفَحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أُنْدَادٍ

مہرا داکر کے قید نکاح میں لائے والے ہو
نہ کہ عکلائیر یا چوری تھپے ناجائز تعلقات
پیدا کرنے والے۔

(المائدہ - ۵)

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی
نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق
میں اخصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد
ہے جس کے لیے ہر دوسری غرض کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ مگر کسی دوسری غرض کے
لیے اس کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لیے مقید کیا جاتا
ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطری خواہشات
پوری کریں۔ لیکن اگر کسی قید نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود
اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو، تو بجائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے
کے لیے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر
ایسی قید نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لیے ایلا کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ چار
مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گزرنے پر
بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس
سے وہ ہم بستری نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت اپنے

واعیاتِ فطرت کو پورا کرنے کے لیے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہوگی جسے اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ فَلَا تَعْبُدُوا كَلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَمَا مُلْحَقَاتٌ - یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ایسی حالت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو۔ ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو، یا جس سے اس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دینا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اس لیے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال، جوہر کی صورت میں اسے ملا تھا، یا اس سے کم زیادہ دے کر قید نکاح سے رہائی حاصل کر لے۔ قانون اسلامی کی ان دفعات کو آگے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اگرچہ وہ قید نکاح کو حتی الامکان ہر طریقے سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو وہاں اس متاعِ گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلامی قانون کی

جو فوائد آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی اسپرٹ کے مطابق نافذ کرنے کے لئے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

مَوَدَّتْ وَرَحْمَت

دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودت و رحمت کی بنیاد پر ہوتا کہ مناکحت سے تمدن و تہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کو وہ اپنے اشتراکِ عمل سے بدرجہہ اتم پورا کر سکیں اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت و مسرت اور سکون و آرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نیکان میں زوجیت کا تصور ہی مودت و رحمت ہے۔ اور زوجین بنائے ہی اس لیے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

(الروم - ۲۱)

اور دوسری جگہ فرمایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا

وہی ہے جس نے تم کو تین واحد سے پیدا کیا

اور اس کیلئے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا

ذُو نَبِيٍّ اَلَيْسَ كُنَّ اِلَيْهَا دَاعِيَةً (۱۸۹) بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

پھر ایک دوسرے پر ایہ میں زوجیت کے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے۔

كُنَّ لِبَاسٍ لِّكُمْ وَاَنْتُمْ

لِبَاسٍ لِّهِنَّ (بقرہ-۱۸۷) لیے لباس۔ اور تم ان کے لیے لباس۔

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان

کے جسم سے متصل رہتی ہے اور اس کی پردہ پوشی کرتی ہے اور اس کو خارجی فضا

کے مضر اثرات سے بچاتی ہے۔ اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لیے استعمال

کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے

ویسا ہی تعلق ہونا چاہیے جیسا جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے دل اور

ان کی روحیں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی

کریں، اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں، جو ان کی عزت اور ان کے

اخلاق پر حرف لانے والے ہوں۔ یہی مقتضی ہے مودت و رحمت کا اور اسلامی

نقطہ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ روح

نہیں ہے، تو گویا وہ ایک بے جان لاش ہے۔

اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لیے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان سب میں

اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، تو صلح و

اشتہی، محبت اور رومی یک جہتی کے ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور

آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔ لیکن وہ اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی ایک

جانی سے جدائی بہتر ہے۔ کیونکہ مودت و رحمت کی روح نکل جانے کے بعد ازدواجی

تعلق ایک مردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفو نہ پیدا ہوگی، اور اس سے
خانگی زندگی کی ساری فضا زہرا کو دہو جاتے گی۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے۔

وَإِنْ تَصَلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ
اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا إِنَّ
يَتَفَرَّقَا يَغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ
سَعْتِهِ

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے
سے زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ
بخشنے والا مہربان ہے اور اگر (یہ نہ ہو سکے) اور
زوجین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ
اپنے وسیع خزانہ غیب سے ہر ایک کی
کفالت کرے گا۔

(النساء - ۱۲۹-۱۳۰)

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ۔

فَأَمْسَاكُ بِمَعْرُوفٍ أَوْ
تَسْرِيحُ بِإِحْسَانٍ -
(البقرہ - ۲۲۹)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھا
جائے یا احسان (خوش اسلوبی) کے ساتھ
رخصت کر دیا جائے۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُو
هُنَّ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق - ۲)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھو یا
بھلے طریقہ سے ان سے جدا ہو جاؤ۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
(النساء - ۱۹)

اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح رہو۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ
تَسْرِيحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا
تُكْسِرُوهُنَّ ضَرَارًا لِّتَعْتَدُوا

یا تو بھلے مانسوں کی طرح ان کو رکھو یا بھلے مانسوں
کی طرح رخصت کر دو۔ محض ستانے کیلئے
ان کو نہ روک رکھو کہ ان کی حق تلفی کرنے

لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر
خود ظلم کرے گا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے
عذاب کا مستحق بنائے گا)

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ
ظَلَمَ نَفْسَهُ

(بقرہ - ۲۲۱)

اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو
(یعنی فیاضی کا بڑا ذکر کرو)

وَلَا تُسْرِءُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ

(بقرہ - ۱۲۳۷)

طلاق رجعی کے احکام جہاں بیان کیے گئے ہیں وہاں رجوع کے لئے نیک نیتی
کی شرط لگا دی گئی۔ یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو یہ حق تو
ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی
کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لٹکانے رکھنے کی۔ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ

بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا۔ (البقرہ - ۲۲۸)

غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کی قباحت

یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے تمام ان غیر مسلموں سے
ازدواجی تعلق کو ممنوع کر دیا گیا ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مذہب
اپنے خیالات، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے طور طریقوں میں مسلمانوں سے
اتنے مختلف ہیں کہ ایک حقیقی مسلمان کا دلی محبت اور قلب و روح کی یک جہتی
کے ساتھ ان سے میل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے
کے ساتھ جوڑے جائیں تو ان کا ازدواجی رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض
ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا۔ اور اس میں یا تو مودت و رحمت نہ ہوگی یا اگر ہو
گی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے اور خود اس مسلمان کے لئے مفید ہونے کے

بجائے الٹی مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَلَائِئِكَةً
 خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَا تُنْكَحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَكَعْبَدُ مَوْلَانِ
 خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَا تُعْجَبْكُمْ (البقرہ - ۲۲۱)

”مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک
 مومن لونڈی ایک مشرک شریفیت زاوی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند
 ہو اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ
 ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام ایک مشرک شریفیت زاوی سے
 بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔“

اہل کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں
 سے نکاح کر لیا جائے۔ کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور
 اہل کتاب مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح پھر بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ عورت کی فطرت میں
 اثر پذیری اور قبولیت کا مادہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اس لئے ایک غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی میں غیر
 مسلم شوہر کے ساتھ اس کے رہنے سے یہ خطرہ زیادہ ہے کہ وہ ان کا رنگ اختیار کر لے گی اور یہ توقع بہت
 کم ہے کہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ نیز اگر وہ ان کا اثر قبول نہ کرے تو یہ یقین ہے کہ
 اس کا یہ رشتہ محض ایک شہوانی رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ نہ غیر مسلم شوہر سے وہ مودت و رحمت
 کے ساتھ پیوستہ ہو سکے گی اور نہ غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ اس کا کوئی مفید
 تمدنی رابطہ قائم ہو سکے گا۔

ان کے درمیان اشتراک ہے، لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمایا اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی اِنَّهَا لَا تَحْصُنُكَ، وہ تجھے محسن نہیں بنا سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں دونوں کے درمیان وہ مؤذت و رحمت نہ ہوگی جو احسان کی اصلی روح ہے۔ حضرت عذیبہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کتابیات سے نکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہ اسبیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالفت ہوں۔ اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا؟

مسئلہ کفایت

خود مسلمانوں کے درمیان بھی شریعت یہ چاہتی ہے کہ ازدواجی تعلق ایسے مرد و عورت کے درمیان قائم ہو جن کے درمیان، غالب حال کے لحاظ سے، مؤذت و رحمت کی توقع ہو اور جہاں یہ توقع نہ ہو وہاں رشتہ کرنا مکروہ ہے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے پہلے عورت کو ذکیوہ لینے کا حکم دیا کم از کم مشورہ دیا ہے۔

اذا تحطب احدكم المرأة
فان استطاع ان ينظر الى ما
جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو
نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اسے دیکھ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شُرَکَآءُکُمْ فِیۡ مَا کَفَرْتُمْ مِنْۢ بَیِّنٰتٍ اِیۡمَانٍ ۚ سُبُوْحٰنَ لِلّٰهِ مَا یَعْمَلُ ۙ
 لینا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو اس کو اس عورت سے نکاح کی رغبت لانے والی ہو۔
 ابو داؤد

اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نکاح کے معاملہ میں کفار ت (ہمسری) کو ملحوظ رکھنا پسند کرتی ہے اور خیر کف میں نکاح کو مناسب نہیں سمجھتی۔ جو عورت اور مرد اپنے اخلاق میں، اپنی دینداری میں، اپنے خاندان کے طور طریقوں میں، اپنی معاشرت اور رہن سہن میں، ایک دوسرے سے مشابہت یا کم از کم قریبی مماثلت رکھتے ہوں، ان کے درمیان مودت و رحمت کا رابطہ پیدا ہونا زیادہ متوقع ہے اور ان کے باہمی ازدواج سے یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کے خاندان بھی اس رشتہ کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو سکیں گے۔ بخلاف اس کے جن کے درمیان یہ مماثلت موجود نہ ہو، ان کے معاملہ میں زیادہ تر اندیشہ یہی ہے کہ وہ گھر کی زندگی میں، اور اپنے قلبی و روحی تعلق میں، ایک دوسرے سے متصل نہ ہو سکیں گے اور اگر شخصاً میاں اور بیوی باہم متصل ہو بھی جائیں تو کم ہی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ دونوں کے خاندان آپس میں مل سکیں۔ شرع اسلامی میں مسئلہ کفارت کی یہی اصل ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانتِ اخلاق و عفت کے بعد دوسری چیز جو اسلام کے قانونِ ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان مودت و رحمت ہے۔ جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتہ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے۔ مگر جب یہ مودت و رحمت باقی نہ رہے اور اس

کی جگہ بے ولی، سردہری، نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے، تو قانون کا میلان
 رشتہ نکاح کی گمراہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس
 قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیوں کہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر
 کے قانونِ اسلام کے اصولوں کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی
 غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

اصولِ قانون

قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی قانونِ ازدواج کی تدوین کن اصولوں پر کی گئی ہے۔ اس لیے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معام ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصلِ اوّل

اصولِ قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوئے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے۔

وَالرِّجَالُ عَلَى النِّسَاءِ كَرَجَةٌ، اس درجے کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَتَلَ اللَّهُ لِعَفْسِهِمْ عَلَى بَعْضٍ وَمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَنَاطِتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (النساء-۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں بتوفیق الہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو توأم کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں۔ فلسفہ اجتماع کی بحث ہے۔ اپنے موضوع زیر بحث کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بہر حال زوجین میں سے ایک کوأم اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی اختیارات رکھنے والے ہوں تو بد نظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے، جیسی کہ فی الواقع ان قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے، اس لیے کہ اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو توأم اور صاحب امر، اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا اور توأمیت کے لیے اس فریق کا انتخاب کیا جو فطرتاً ہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

مرد کے فرائض :-

پس اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مرد کی حیثیت توأم کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

لے توأم (Sustainer, Provider) حاکم، محافظ

سربراہ کار، معاملات کا منتظم اور نگران (Protector)

لے اس بحث کو اگر کوئی صاحب مفصل دیکھنا چاہے تو میری کتاب "پردہ" ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مہر۔ یہ کہ وہ عورت کا مہر ادا کرے۔ کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوقِ زوہبت حاصل ہوتے ہیں وہ مہر کا معاوضہ ہیں۔ اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگر یہ اہل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی تو آمیت کا مستحق ہے مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً:

وَأَتُوا النِّسَاءَ مَدُّ قَتِهِنَّ

اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ

ادا کرو۔

(النساء-۴)

مَحَلَّةً

وَأَحِلَّ لَكُمْ مِمَّا رَزَاكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ
مُحْصِنِينَ غَيْرُ مُسْفِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ
فَأْتُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء-۴۳)

ان محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں تاکہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرنے کی خواہش کرو۔ قید نکاح میں لانے کے لئے نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لئے۔ پس ان سے تم نے جو تمنا کیا ہے اس کے بدلے میں فرار داد کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔

پس لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں کی

فَأَنْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ

اجازت سے نکاح کرو۔ اور مناسب طور پر

وَأَذُوهُنَّ أَبْرَزَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

ان کے مہر ادا کرو۔

(النساء-۲۵)

اور حلال کی گئیں تمہارے لیے عزت دار

وَالْمُحْسِنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ

عورتیں مومنوں میں سے اور عزت دار عورتیں

وَالْمُحْسِنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ

مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجْرًا
 اُن لوگوں میں سے جن کے پاس تم میں سے پہلے
 کتاب بھیجی جا چکی ہے جبکہ تم ان کے ہر ادا کر دو۔
 (مائدہ ۵-۵) -

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو
 پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو
 حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش
 ہونے کی کوئی صورت مرد کے لئے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت
 دے۔ یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے، یا اس پر احسان کر کے برضا
 رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَإِنْ طَهَّرْتُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا
 پھر اگر وہ خوش دلی کیساتھ مہر میں سے کچھ

لے۔ اسی کو مہر مؤجل کہتے ہیں۔ مگر آج کل مہر مؤجل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ نکاح کے وقت ہزاروں
 لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھ دی جاتی ہے کہ "کون لیتا ہے کون دیتا ہے"۔ گویا ابتدا ہی سے
 ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جاتے وہ عند اللہ
 فاسد ہے۔ حقیقی مہر مؤجل وہ ہے جس میں واضح طور پر مدت کا تعین کیا گیا ہو کہ مرد
 اتنی مدت میں اسے ادا کرے گا۔ اور جس مہر کی قرارداد میں مدت کا تعین نہ ہو وہ
 عند الطلب (On Demand) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے ان فقہاء سے سخت
 اختلاف ہے جو ایسے مہر کو شوہر کی وفات کے بعد واجب الادا بتاتے ہیں۔ گویا نکاح تو شوہر
 کرے اور مہر اس کے وارثوں پر عائد ہو۔ یہ چیز مذکورہ بالا آیات قرآنی کی روح کے بالکل خلاف
 ہے اور اس فتوے کیلئے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

تَكُلُّوهُ هَتِيًّا مَرْبِيًّا (النساء-۴)

معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا

اور اگر تم قرار داد کے بعد اس میں کم زیادہ

تَرَخْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيزَةِ

پر یا بھی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو

(النساء-۴)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۲۱) نفقہ - شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدودِ عمل کی

دانش طور پر تقسیم کر دی ہے۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض

انجام دینا ہے (وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ) اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لیے

ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنیاد شوہر کو اپنی بیوی

پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے اور یہ چیز تو اہمیت کے عین منہوم میں داخل ہے۔

تو اہم کہتے ہی اس شخص کو ہاں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبر گیری کرنے والا ہو اور اسی

حیثیت سے اس شے پر اقتدار رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت الرَّجَالُ قَوَّامُونَ

عَلَى النِّسَاءِ ہیں وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت

ہوتا ہے، اسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر شوہر اس ذمہ داری کو

ادانہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکاریا بصورت

عدم استطاعت، اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی

خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس

بارے میں ایک نامذہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدْرُهَا وَعَلَى

الْمُقْتَرِقِ قَدْرُهَا۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر

اس کی استطاعت کے مطابق۔ یہ نہیں کہ شریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے

جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو، یا مال دار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔
 (۳) ظلم سے اجتناب۔

مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو تہہ جمعی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً ایلا۔۔۔

عورت کے واعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائز کے بغیر اعراض کرنا جس کا مقصد محض اس کی ہمزادینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لئے قانونِ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلقِ زن و شوہر قائم کر لے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِينَ يُؤَلُّونَ مِنْ نِسَائِهِمْ نَرْبِصَ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَاَوْفُوا بِاللّٰهِ غَفْرًا رَّحِيْمًا وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ - ۲۲۷)

جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

لے عذر جائز سے مراد ہے مرد یا عورت کی بیماری۔ یا مرد کا حالتِ سفر میں ہونا یا کوئی ایسی صورت پیش آجائے جو عورت پر عیب کی کیفیت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے کا موقع نہ ہو۔

اس مسئلہ میں بعض فقہانے حلف کی شرط لگاتی ہے، یعنی اگر شوہر نے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا برہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر قسم نہیں کھائی تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے، اُس پر ایلا برہ کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل حسب ذیل ہیں۔

اول یہ کہ قرآن مجید اگر کسی خاص صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم دے اور ایسے الفاظ استعمال کرے جن کا اطلاق اسی صورتِ معاملہ پر ہوتا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حکم کا اطلاق اسی صورتِ معاملہ پر ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن نے سوتیلی بیٹی کو اس کے باپ پر حرام کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں **وَرَبَّائِكُمُ الشُّرَكَاءُ فِي حَبْؤِكُمْ** اور تمہاری وہ پردہ لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اس سے صرف ان لڑکیوں کے حرام ہونے کا حکم نکلتا ہے جو چھوٹی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ سوتیلے باپ کے گھر آئی ہوں۔ مگر کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ یہ حکم صرف اسی صورت کے لیے خاص ہے۔ بلکہ سب اُس لڑکی کے حرام ہونے پر بھی متفق ہیں جو سوتیلے باپ اپنی ماں کے نکاح کے وقت جوان ہو اور جس نے ایک دن بھی اُس باپ کے گھر میں پرورش نہ پائی ہو۔ اسی طرح اگر قرآن نے لفظ **يَوْمَئِذٍ مِّنْ نِّسَاءِهِمْ** (بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھاتے ہیں) کے الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کے لیے جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ صرف قسم کھانے والے لوگوں ہی کے لیے خاص ہو۔

دو قسم یہ کہ احکام فقہیہ کے اشتباظ میں یہ اصول قریب قریب ساری امت میں متفق علیہ ہے کہ جس صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم نہ پایا جاتا ہو، اُس کو کسی ایسی صورتِ معاملہ پر تیس کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں حکم موجود ہو۔ بشرطیکہ دونوں میں علتِ حکم مشترک ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ شارع نے ایلا کرنے والوں کے لیے چار مہینے کی مدت کس لیے مقرر کی ہے؟ اور کیوں یہ فرمایا ہے کہ اگر اس مدت کے اندر رجوع نہ کرو تو پھر طلاق دے دو؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتائی جاسکتی ہے کہ چار مہینے سے زیادہ مدت تک مقاربت سے پرہیز کرنا عورت کے لئے موجبِ ضرر ہے اور شارع ضرر ہی کو روکنا چاہتا ہے؟ اسی آیت سے اگلے رکوع میں شارع کا یہ ارشاد موجود ہے کہ **وَلَا تَهْسَبُوهُنَّ خِفَافًا لِتَتَعْتَدُوا** (ان کو محض ضرر کے لئے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو) اور سورہ نسا میں شارع فرماتا ہے **فَلَا تَبِيلُوا** **كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ** (پس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ ٹھہک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو)۔ ان اشارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نکاح میں بھی رکھنا اور پھر اسے معلق رکھ چھوڑنا اور محض سنانے کے لئے روک رکھنا شارع کو پسند نہیں ہے۔ اس کے سوا چار مہینے کی مدت مقرر کرنے کی کوئی دوسری علت بیان نہیں کی جاسکتی۔ اب اگر یہی علت اس صورت میں بھی پائی جاتی ہو جب کہ شوہر قسم کھائے بغیر بیوی سے قصداً مباشرت کرنا چھوڑ دے تو کیوں نہ اس پر بھی یہی حکم نافذ کیا جائے؟ آخر قسم کھانے یا نہ کھانے سے نفسِ ضرر میں کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ شوہر قسم کھا کر ترکِ مباشرت کرے تو ضرر ہوگا۔ اور اگر اس نے قسم نہ کھائی تو ساری عمر بھی اس بیوی کے پاس

نہ جانے سے کوئی ضرر نہ ہوگا۔

سوم یہ کہ اسلامی نقطہ نظر سے ازدواجی قانون کا اہم ترین مقصد اخلاق اور عصمت کی حفاظت ہے۔ ایک مرد اگر ایک بیوی سے ناراض ہو کر دوسری بیوی کو لے تو وہ اس طرح اپنے آپ کو بدکاری و بد نظری سے بچا سکتا ہے۔ لیکن وہ عورت جسے اس کے شوہر نے خواہشاتِ نفس کی تسکین سے مستقل طور پر محروم کر رکھا ہو، کس طرح اپنے اخلاق کی حفاظت کر سکتی ہے جب تک کہ اس کا شوہر اس کی طرف رجوع نہ کرے؟ کیا شارعِ حکیم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسی عورت کے شوہر نے اگر اس سے الگ رہنے کی قسم کھائی ہو تب تو وہ اس کے اخلاق کی حفاظت کا بندوبست کرے گا ورنہ اسے بغیر محدود مدت تک بد اخلاقی کے خطرے میں مبتلا چھوڑے گا؟ ان وجوہ سے میرے نزدیک فتوے فقہائے مالکیہ کے مسلک پر ہونا چاہیے جو فرماتے ہیں کہ اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے مباشرت ترک کرے تو اس پر بھی ایلاہ ہی کا حکم لگایا جائے گا، اگرچہ اس نے قسم نہ کھائی ہو۔ کیونکہ ایلاہ پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصد ضرر کو روکنا ہے اور یہ علت اس ترکِ مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حالت کے بغیر بقصدِ ضرر کیا جائے۔^۱

فَإِنْ حَزَمُوا الطَّلَاقَ كِي تَفْسِيرٍ فِي مَعْهَدِ فَتَاهَا رَكِي اِخْتِلَافٌ هُوَا

ہے۔ حضرت عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت کا گزر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے

۱ احکام القرآن لابن عربی جلد ۱ صفحہ ۵، و بدایۃ المجتہدین لرشد جلد ۲ صفحہ ۸۸

کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اس معنی میں منقول ہے۔ مگر ایک دوسرا قول جو موخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ اپنی بیوی سے رجوع کر دیا اس کو طلاق دے دو۔ لیکن جیب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والوں کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہی ہے۔ اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز طلاق اور جدائی کے اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے، اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے۔

ضرار اور تعدی :-

عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض تسانے اور زیادتی کرنے کے لئے اس کو رکھ چھوڑے۔ بار بار طلاق دے اور دو طلاقیوں کے بعد تیسری طلاق سے پہلے رجوع کر لے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔

وَلَا تُنْسِكُوْهُنَّ حَتّٰی يَضْرِبَ الرَّجُلُ مَدْرَاجَهُنَّ
اور ان کو تسانے اور زیادتی کرنے کے لئے

لے یہ امر مختلف فیہ ہے کہ یہ طلاق، ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے یا رجعی کے حکم میں :-

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ
نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا
نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے
اوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا
(بقرہ - ۲۳۱)

ضرر اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور
زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے
گا۔ روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا۔ ادنیٰ طبقہ کا ہو گا تو مار پیٹ اور گالم گلوج کرے گا۔
اوپر طبقے کا ہو گا تو تذلیل اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرر اور
تعدی کے الفاظ سب پر حاوی ہیں اور قرآن مجید کی رو سے یہ صرف افعال ممنوع ہیں۔

۱۔ قانون کے الفاظ سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھانا جو قانون کے مقصد اور اس کی روح کے خلاف
ہو، دراصل قانون سے کھیلنا اور اس کا مذاق بنانا ہے۔ قرآن میں مرد کو ایک طلاق یا دو
طلاق دے کر رجوع کر لینے کا جو حق دیا گیا ہے وہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ اگر اس
دوران میں زوجین کے درمیان مصالحت ہو جائے اور ان کے باہم مل جل کر رہنے کی کوئی
صورت نکل آئے تو ثمر بعیت کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ حاصل نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی
شخص اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق دے۔ پھر عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر
لے۔ پھر طلاق دے اور پھر رجوع کر لے اور اس حرکت سے اس کی غرض یہ ہو کہ عورت
کو خواہ مخواہ ٹکائے رکھے، نہ اپنے گھر میں لے جائے اور نہ اسے آزاد ہی کرے کہ بیچاری
کہیں اور نکاح کر سکے، تو یہ خدا کے قانون سے مسخرہ پن اور کھیل ہے، جس کی جرأت
کوئی سچا مومن نہیں کر سکتا۔

جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا:-

متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا ظلم ہے جسے قرآن مجید صاف الفاظ میں ناجائز ٹھہراتا ہے۔

فَلَا تَمِيلُوا أَكْلَ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ - (النساء - ۱۲۹) کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآن مجید میں تعددِ ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے تو اسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ خود اس آیت میں بھی جہاں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكُمْ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا - (النساء - ۳) پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو۔ یہ زیادہ تر قرین مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اَلَّا تَعُولُوا کے معنی یہ کئے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے۔ لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔

قانون کے لئے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لئے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ قیامتاً اور محبت آمیز ہونا چاہیے۔ رات دن کی تھکائی تھکی تھکی کے ساتھ زندگی گزارنا حماقت ہے۔ اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو۔ نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طانت سے نافذ نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ ممکن ہی ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے۔ لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عدل و انصاف اور رحمت و مودت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق :-

مرد کو قرابت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اوپر بیان ہوئیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ تو اعم ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

(۱) حفظ للغیب عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَفِظَتْ
لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ

اور غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ

(النساء: ۳۴) کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں حفظ للغیب سے مراد ہر اُس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اُس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس رہے۔ اُس میں اس کے نسب کی حفاظت، اس کے نطفے کی حفاظت، اُس کی آبرو کی حفاظت، اس کے مال کی حفاظت

اُس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہو گا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

۲۷) شوہر کی اطاعت۔ مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے نَالصَّالِحَاتِ قَنِيتُ (النساء - ۳۴) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

ان لکم علیہن ان لایوطئن
فرشکم احدًا تکرھونہ
تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں
کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم
ناپسند کرتے ہو۔

لَا تَصَدَّقْ بِشَيْءٍ مِنْ بَيْنِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنْ فَعَلْتَ كَانَ
لَهُ الْاَبْحَرُ وَعَلَيْهَا الْوِزْرُ وَلَا تَخْرُجْ مِنْ بَيْنِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ
وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے۔
اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہو گا۔ نیز وہ
اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لَا تَصُومُ الْمَرْأَةُ لِیَوْمٍ مَا وَزَّوْجُهَا
شَاهِدٍ مِنْ غَيْرِ رَمَضَانَ إِلَّا
بِإِذْنِهِ (احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ)
عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان
کے سوا نفل روزے اس کی اجازت کے
بغیر ایک دن بھی نہ رکھے۔
بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو
مخیر النساء امرأۃ اذا نظرت

اَلِيهَا سِرِّكَ وَاِذَا امرتْهَا اطاعتك
 وَاِذَا غَيْبْتَ عَنْهَا حَفِظْتَكَ فِي
 مَالِكَ وَنَفْسِهَا
 دیکھیے تو تیرا دل خوش ہو جائے اور جب تو
 اس کو حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے
 اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ
 تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی
 حفاظت کرے۔

اسی عام حکم اطاعت میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر
 عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس کا حکم ماننے سے
 انکار کر سکتی ہے بلکہ اسے انکار کر دینا چاہیے۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے
 منع کرے یا شراب پینے کا حکم دے یا پرودہ شرعی ترک کرے، یا فواحش کا
 ارتکاب اس سے کرانا چاہے، تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا
 فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے۔ اس لئے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی
 مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ كَلِّمَةُ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ اس
 صورتِ خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے اگر
 نہ کرے گی تو نافرمان ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کی
 تفصیل آگے آتی ہے۔

مرد کے اختیارات :-

قانون اسلام نے چونکہ مرد کو توأم بنایا ہے اور اس پر عورت کے مہر، نفقہ
 اور نگہبانی و خبرگیری کی ذمہ داری عائد کی ہے، اس لیے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے
 اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے اور اپنے گھر کے اخلاق اور

حسن معاشرت کی حفاظت کرنے اور خود اپنے حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانونِ اسلام میں ان اختیارات کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دیئے گئے ہیں، جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کیئے جاسکتے ہیں۔

رانا نصیحت: تاویپ اور تحریر اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے بڑاڑ میں حسبِ ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے۔ اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

اور جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو ان کو نصیحت کرو۔ اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی طریقہ نہ ڈھونڈو۔

وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ
فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي
الْمَضَاجِعِ وَاصْرِبُوهُنَّ فَإِنْ
أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ
سَبِيلًا (النساء - ۳۴)

اس آیت میں وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) فرما کر سزا کے طور پر ترکِ مباشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر آیتِ ایلاہ

لے۔ نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے، خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

نے، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اس کے لئے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے کہ یہ بستر کی علیحدگی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الہی اس کو طلاق دے دے گا، اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے چار مہینے کی مدت ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہو گا۔ کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا، یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سکھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یا وہ حسن معاشرت کے ساتھ کم از کم اس شوہر سے نباہ نہیں کر سکتی۔ نیز اس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لئے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لئے کسی ناجائز طریقے کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی نکتہ میں مبتلا ہو جائے یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں میاں بیوی میں سے ایک اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں موت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے **وَ اَخْبَرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** کے معنی میں ایک دوسرا

قول منقول ہے۔ وہ کلام عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ہجس کے معنی، باندھنے کے ہیں۔ **هَجَرَ** البعیر اذا ربطه صاحبہ بالہجر۔ ہجر اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ

کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔ لیکن یہ معنی قرآن مجید کے منشاء سے بعید ہیں۔ فی المصاحح کے الفاظ میں قرآن نے اپنے منشاء کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے مفسح سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور سونے کی جگہ میں باندھنا بالکل بے معنی بات ہے۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی ہے کہ ضرب شدید نہ ہونی چاہیے۔

اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں
تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔
ممنہ پر نہ مارے اور کالم کلوز نہ کرے۔

اَضْرِبُوهُنَّ اِذَا عَصَيْنَكُمْ
فِي الْمَعْرُوفِ ضَرْبًا غَيْرَ مُبْرِحٍ
وَلَا يَضْرِبُ الْوَجْهَ وَلَا يَقْبِضُ

یہ دو سزائیں دینے کا مرد کو اختیار دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جاسکتی ہے جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو۔ نہ یہ کہ ہر جاو بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَمَنْ اخْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاحْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اخْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ۔ جو کوئی تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام، اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر پھجائی المصاحح اور جس پر

بھرنی المصباح کافی ہے اس پر بارنا ظلم میں شمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صرف شدید اور ناقابل برداشت تصور پہ ہی دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کی زیادتی ہوگی اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے امداد طلب کرے۔

(۲) طلاق - دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مرد اپنا مالی خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لیے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہو جائے تو

اے۔ بعض لوگ اہل مغرب کی تقلید میں یہ چاہتے ہیں کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر سے چھین کر عدالت کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ٹرکی میں ایسا کر بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ چیز قطعی طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن نے طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے ہر جگہ فعل طلاق کو شوہر کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَيَا نَ طَلَّقَهَا۔ وَ اِنْ عَزَّ مَوْا الطَّلَاقَ وَغَيْرِهِ۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے۔ پھر قرآن صاف الفاظ میں شوہر کے متعلق کہتا ہے کہ رِبِّسِدِ ۙ حُقْلَةً ۙ النِّكَاحِ (البقرہ - ۲۳۷) نکاح کی گہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اب کون یہ حق رکھتا ہے کہ اس گہ کو اس کے ہاتھ سے چھین کر قاضی کے ہاتھ میں دے دے۔ ابن ماجہ میں عبد اللہ بن عباس کی روایت ہے کہ ایک شخص نے اکبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی ہے۔ غلام ہے کہ جو شخص اپنا زچہ پیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا، وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا، جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کر نیکا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس فریق کے مفاد کا لحاظ کرے گا۔ جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

(حاشیہ عقبہ ص ۴۴) شکایت کی کہ میرے اتانے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ اب وہ اسے مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس پر آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا: یا ایہا الناس ما بال احدکم یندج عبداً لامته ثم یرید ان یصرف بیئہا، انہا الطلاق لمن اخذ بالساق۔ لوگو! یہ کیا ماجرا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام سے اپنی لونڈی پاہ دیتا ہے۔ اور پھر دونوں کو جدا کرنا چاہتا ہے۔ طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے، یہ حدیث اگرچہ سند اتومی نہیں ہے، مگر قرآن کی مطابقت اس کو قوت بخشتی ہے۔ پس قول خدا و سوال کی بنا پر یہ ہرگز نہ جائز نہیں ہے کہ طلاق دینے کے اختیارات شوہروں سے چھین کر غلاموں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور عقلاً بھی یہ بالکل ایک غلط حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی خانگی زندگیوں کے شرمناک جھگڑوں اور بدناما واقعات کی برسر عدالت تشہیر ہونے لگے:

اصل دوم

اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو
 امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے
 ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جلتے مگر جب ان کے درمیان
 محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور رشتہ مناکحت میں ان کے
 بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و
 کراہت اور طبائع کی نا موافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے
 پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس صورت میں ان کے لئے اور سوسائٹی کے لئے بہتر یہی
 ہے کہ ان کی علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت
 انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم
 کیا ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف وہ رشتہ
 نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے، مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں
 ہے کہ زوجین کے لئے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے،
 بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے
 کھولتا ہے، مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں
 ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہی اور رشتہ ازدواج
 کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہونے لگا۔
 اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ ہیں۔ طلاق،

خُلع اور نِصائے قاضی۔

طلاق اور اس کی شرائط :-

اصطلاح شرعی میں طلاق سے مراد وہ علنی حدی ہے جس کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے ان حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے ہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ** (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور **تَزَوَّجُوا وَلَا تَطْلِقُوا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَحِبُّ الذَّوَاتِينَ وَالذَّوَاتِ ارشادیاں کر د اور طلاق نہ دو۔** کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے، جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارہ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو، تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔

وَعَاثِرُوا هُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكُنَّ
هُنَّ أَشْيَاءً وَيَجْعَلُ اللَّهُ فِيهِ
خَيْرًا كَثِيرًا (النساء - ۱۹)

ان کیساتھ اچھے سلوک سے رہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو سوہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو۔ مگر تک

لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک ٹکڑے کے فاصلے سے ایک ایک
 طلاق دو تیسریں ٹکڑے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا
 ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔ یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش
 آئند تغیر ہو جائے۔ یا خود تمہارا ہی دل بدلی جائے۔ البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے
 اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر چاہو
 تو تیسریں ٹکڑے پر آخری طلاق دے دو۔ ورنہ رجوع کئے بغیر یونہی عدت گذر
 جانے دو۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكٌ
 بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيَةٌ بِإِيجَابٍ
 (بقرہ - ۲۲۶)

طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو پہلے طریقے
 سے روک لیا جائے یا پھر شریعاً نہ طریقے
 سے چھوڑ دیا جائے۔

مُطَلَّقَةٌ عَوْرَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثِينَ
 مَرَّاتٍ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ
 أَوْ تَسْرِيَةٌ بِإِيجَابٍ

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک

ملے احسن طریقہ یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق نہ دی جائے۔ بلکہ یوں ہی عدت گذر جانے
 دی جائے۔ اس صورت میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ اگر یہ زوجین باہم نکاح کرنا چاہیں
 تو دوبارہ ان کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسری بار طلاق دینے سے طلاق منع ہو جاتی ہے
 جس کے بعد تحلیل کے بغیر سابق زن و شوہر کا ایک دوسرے سے پھر نکاح نہیں ہو سکتا۔
 افسوس یہ ہے کہ لوگ بالعموم اس مسئلے سے ناواقف ہیں۔ اور جب طلاق دینے پر
 آتے ہیں تو چھوڑتے ہی تین طلاق دے ڈالتے ہیں۔ بعد میں پچھتاتے ہیں اور مفتیوں
 سے جیلے پوچھتے پھرتے ہیں۔

بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةً قَوْلَهُ
 وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِزَوْجِهِنَّ فِي
 ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا

انتظار میں رکھیں اگر ان کے شوہر
 اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس مدت میں
 وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں

گے۔

رقبہ - ۱۲۲۸

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین حیضوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر
 سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو، ممکن ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دل ملنے کی کوئی
 صورت نکلی آئے۔

إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْضُوا الْعِدَّةَ تَحَاجًّا
 وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا
 يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِغَا حِشَّةٍ مُبِينَةٍ وَتِلْكَ
 حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ
 لَا تَدْرِي لَعْنُ اللَّهِ لَئِنْ يَجِدْتُمْ لِعَدَّتِ لَيْكَ أَمْراً فَاذْأَبْلَعْنَ
 أَجَلَهُنَّ فَاْمَسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

(الطلاق - ۱-۲)

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو زمانہ عدت میں رجوع کی گنجائش رکھتے ہوئے
 طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں
 سے نکالی نہ دو۔ اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی برائی
 کی ترکیب ہوتی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز
 کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد

کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ بدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں، تو یا ان کو بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے جدا ہو جاؤ۔

پھر حالتِ حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طہر کی حالت میں دو۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ حیض کی حالت میں عموماً عورتیں سڑھ سڑھ می اور بد مزاج ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے جسمانی نظام میں کچھ ایسا تغیر واقع ہو جاتا ہے کہ بلا ارادہ ان سے وہ باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں، جنہیں عام حالت میں وہ خود پسند نہیں کرتیں۔ یہ ایک طبی حقیقت ہے۔ اس لئے زمانہ حیض میں میاں اور بیوی میں جو نزاع واقع ہو جائے اس پر طلاق دینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں زوجین کے درمیان وہ جسمانی تعلق نہیں ہوتا جو ان کی باہمی دل چسپی و چسپیدگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس زمانے میں دونوں کے درمیان بد مزگی پیدا ہو جانا بعید نہیں ہے۔ یہ رکاوٹ دور ہو جانے کے بعد توقع کی جاسکتی ہے کہ شاید جذباتِ لطیف زوجین کو پھر باہم شیر و شکر کر دیں اور وہ غبار دور ہو جائے جو شوہر کو طلاق کی طرف مائل کر رہا تھا۔

انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبد اللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانہ میں طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سن کر رہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے

اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس فعل پر تویح فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی۔

”ابن عمر تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹھہر کا انتظار کرو۔ پھر ایک ایک ٹھہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ (تیسری مرتبہ) ظاہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دو یا اس کو روکو۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ اِذْ عَرَيْتَ لَوْ كُنْتَ طَلَّقْتُمَهَا ثَلَاثًا اِنْ كَانَ لِي اَنْ اُرَاجِعَهَا
 ”اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟“
 حضور نے فرمایا:۔

لَا كَانَتْ تَبَيِّنٌ وَتَكُونُ مَعْصِيَةً۔

”نہیں، وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔“ (دارقطنی و ابن ابی شیبہ)

اس سے ایک اور بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے۔ دراصل یہ فعل شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے۔ اور اس سے اللہ کی وہ حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام سورہ طلاق میں سخت تاکید حکم دیا گیا ہے۔ حضرت

۱۔ جیسا کہ ابھی نشوونما دیر پہلے ہم بیان کر آئے ہیں، شریعت کا منشاء تو یہ ہے کہ جواز و اجبی تعلق ایک مرتبہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قائم ہو گیا اسے حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اور اگر توڑا بھی جائے تو اس وقت جب کہ زباہ اور مصالحت کے تمام امکانات

عمر ابن خطاب کے متعلق منقول ہے کہ جو شخص مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا ان کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جدا کر دیتے۔

حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت

تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا:-

إِنَّهُ قَدْ عَصَى رَبَّهُ زَبَانًا امْرَأَتَهُ (ابن جریر)

”اُس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی عورت اس سے جدا

ہو گئی۔“

حضرت علی رضی فرماتے ہیں:-

لَوْ أَنَّ النَّاسَ أَصَابُوا أَحَدَ الطَّلَاقِ مَا نَدِمَ أَحَدٌ عَلَى امْرَأَتِهِ

”اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے، تو کسی شخص کو

اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔“

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت روکاؤٹ

(بقیہ ساشید ص ۵۵) ختم ہو چکے ہوں۔ اس بنا پر شریعت چاہتی ہے کہ جو شخص بھی طلاق

دے خوب سوچ سمجھ کر دے اور طلاق دینے پر بھی صلح صفائی کا دروازہ تین جھوٹے تک

کھلا رہے۔ مگر جو شخص بیک وقت تین طلاق دیتا ہے۔ وہ ان تمام مصلحتوں کو ایک ہی

در میں کاٹ پھینکتا ہے۔

یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاقِ مُتَخَلَّفٌ سے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تاؤتقیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا و رغبت اسے طلاق نہ دے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ
بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا۔
(لقبرہ - ۲۳۰)

پھر اگر وہ اس کو تیسری بار طلاق سے دے
تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہو
سکتی جب تک وہ ایک دوسرے مرد سے
نکاح نہ کر لے۔

یہ ایک ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق
دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا، جب تک
وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کر لے کہ اسے اس عورت کے ساتھ نباہ کرنا ہی نہیں ہے۔
بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لئے یہ حیثیت نکالا ہے کہ جس عورت
کو تین بار طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے
تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرادے اور پھر کچھ دے دلا کر اس
کو عورت سے پہلے طلاق دلوادے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح
فرمادی ہے کہ تمہیل کے لئے محض نکاح ترویج کافی نہیں ہے بلکہ عورت اس وقت

لے۔ یعنی تین طلاق جن کے بعد عورت دوبارہ اس شوہر کے نکاح میں نہیں آسکتی تاؤتقیکہ
اس کا نکاح کسی اور شخص سے ہو کہ فرقت واقع نہ ہو جائے۔

تاک پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت حاصل نہ کر لے۔

لَا تَحِلُّ لَكَ زَوْجُهَا الْأَوَّلِ حَتَّىٰ يَذُوقَ الْآخَرَ عَسَيْتَ تَذُوقُ
عَسَيْتَ -

پھر جو شخص محض اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو ایسا سازشی نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لَعْنَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَعْلُولُ وَالْمَعْلُولَةُ۔ اور ایسے شخص کو آپ تیس مستنعد کرائے کے سانڈ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فی الواقع اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک جیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔

مخلع :-

شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے مخلع کر لے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور

دوسرا قانونی۔

اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو طلاق یا مخلع کا اختیار

صرف ایک آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لئے طلاق اور خلع کو کھیل بنا لیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ:

اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَاتِينَ
وَالذَّوَاتَاتِ

ہر طالب لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

لَعْنَةُ اللَّهِ كُلِّ ذَوَاتٍ
مِطْلَاقٍ -

جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے اس کی کسی زیادتی کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔ خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں۔

أَيْسَاءُ مَرْأَةٌ اخْتَلَعَتْ مِنْ
زَوْجِهَا بِغَيْرِ نَشْرٍ فَعَلِيهَا
لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ
أَجْمَعِينَ الْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ
الْمُنَافِقَاتُ -

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے، اس پہلو سے بحث نہیں کرتا، وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لئے بوقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتہ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لئے بندھے ہوئے ہیں کہ اس گرفت سے آزاد

ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حقوق کو بیجا طور پر استعمال کرے گا، تو اس بارے میں قانون یہاں تک ممکن اور معتدل ہے پابندیاں عاید کرتا ہے۔ مگر حق کے بیجا یا بے جا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیار تیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اُس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالبِ لذت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائزہ حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اسے دینے کے بعد اس کو بے جا استعمال سے روکنے کے لئے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگادی گئی ہیں مثلاً یہ کہ جو مہر اس نے عورت کو دیا تھا، اس کا نقصان گوارا کرے، زمانہ حیض میں طلاق نہ دے، تین ٹھہروں میں ایک ایک طلاق دے، عورت کو زمانہ عدت میں اپنے ساتھ رکھے، اور جب تین طلاق دے چکے تو پھر وہ عورت تحلیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آسکے۔ اسی طرح عورت کو بھی خلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ جن کو قرآن مجید اس مختصر سی آیت میں تمام و کمال بیان کر دیتا ہے۔

وَلَا يَجِبُ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ بِمَا آتَيْتُمُوهُنَّ مِنْ شَيْءٍ
إِلَّا أَنْ يَخَانَا إِلَّا يَفِيًا حَدُّهُ وَاللَّهُ فَإِنْ خِفْتُمْ إِلَّا
يُفِيًا حَدُّهُ وَاللَّهُ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ

بقرہ - ۲۲۹

تہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ **إِلَّا يَهِيَ** کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے، کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزاد ہو جائے۔

اس آیت سے حسبِ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) خلع ایسی حالت میں ہونا چاہیے جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا** کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع ایک بُری چیز ہے، جس طرح کہ طلاق بری چیز ہے، لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی برائی نہیں۔

(۲) جب عورت عقد نکاح سے آزاد ہونا چاہے، تو وہ بھی اسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا، اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے تو وہ اس مال کا ایک حصہ یا پورا مال واپس کر کے جدا ہو سکتی ہے، جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

(۳) افتداء یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے کے لئے محض فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں ہے بلکہ اس معاملہ کا اتمام اُس وقت ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک

مقدار مال پیش کر کے آپ سے آپ علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے اس کو شوہر قبول کر کے طلاق دے دے۔

(۴) خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصہ پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے دے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ کے الفاظ اسپر لالت کرتے ہیں کہ خلع کا فعل طرفین کی رضا مندی سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لئے عدالتی فیصلے کو شرط قرار دیتے ہیں۔ جو معاملہ گھر کے اندر طے ہو سکتا ہے اسلام اسے عدالت میں لے جانا ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(۵) اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس آیت میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر ہی کی طرف ہے چونکہ اولی الامر کا اولین فرض حدود اللہ کی حفاظت ہے، اس لئے ان پر لازم ہو گا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوادیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ محمل احکام ہیں جن میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف کن صورتوں میں متحقق ہو گا؟ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف

کیا ہے؟ اور اگر عورت افتد اوپر آمادہ ہو، لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں تاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی رودادوں میں ملتی ہیں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

صدرِ اول کے نظائر در باب خلع

خلع کا سب سے مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیویوں نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیلات کے مختلف ٹکڑے احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت ابی بن سکول (عبداللہ ابن ابی کی بہن) کا قصہ یہ ہے کہ انہیں ثابت کی صورت ناپسند تھی۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لئے مرافعہ کیا اور ان الفاظ میں اپنی شکایت پیش کی۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا يَجْمَعُ رَأْسِي وَرَأْسَهُ شَيْءٌ أَبَدًا
 انى رفعت جانب الخباء فدأيتہ اقبل في عدا فاذا
 هو أشد هم سوادًا واقصر هم قامةً واقبحهم
 وجهاً۔ (ابن خیر)

۱۔ بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا، مگر مشہور یہی ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا۔ اور عبداللہ ابن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

یا رسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی۔
 میں نے اپنا گھونگھٹ جواٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کیساتھ
 آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سب سے زیادہ کالا اور سب سے زیادہ
 پستہ قد اور سب سے زیادہ بد شکل تھا۔

خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی
 کے سبب سے اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ
 مجھے اس کی بد صورتی ناپسند ہے۔
 خدا کی قسم اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ
 میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت میں اس
 کے منہ پر ٹھوک دیتی۔

یا رسول اللہ میں جیسی خوب صورت ہوں آپ
 دیکھتے ہیں اور ثابت ایک بد صورت شخص
 ہے۔

میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرف نہیں
 رکھتی۔ مگر مجھے اسلام میں کفر کا خوف
 ہے۔

وَاللّٰهُ مَا كَرِهَتْ مِنْهُ
 دِيْنًا وَلَا خَلْقًا إِلَّا انِّي كَرِهَتْ
 وَمَا مَنَّهُ (ابن جریر)

وَاللّٰهُ لَوْلَا خِيفَةُ اللّٰهِ
 اِذَا دَخَلَ عَلَيَّ بِصِفَتِي فِي
 وَجْهِهِ (ابن جریر)

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ جِي مِنْ
 الْجِبَالِ مَا تَرَى وَنَمَائِتِ رَجُلٍ
 رَمِيْمٍ (عبدالرزاق بجوالہ فتح الباری)
 وَمَا اَعْتَبَ عَلَيْهِ فِي تَلْقَئِي
 وَلَا دِيْنٍ وَ لَكِنِّي اَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي
 الْاِسْلَامِ (بخاری و نسائی)

اے اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کہ اہت و نفرت کے باوجود اگر میں اس کیساتھ
 رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان احکام کی پابند نہ رہ سکوں گی، جو شوہر کی اطاعت اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اترو دین علیہ حد یقتہ
 التی اعطاکہ، جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؟ انہوں
 نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے
 فرمایا۔ ابنا الزیادۃ فلا دکن حد یقتہ۔ زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ
 واپس کر دے۔ پھر ثابت کو حکم دیا کہ۔ اقبل الحد یقتہ وطلقہا تطیقہ
 ”باغ قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دیدے۔“ (بخاری و نسائی)

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام
 مالک اور ابو داؤد نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور اپنے
 مکان سے باہر نکلے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے
 عرض کیا۔ لا انا ولا ثابت بن قیس۔ ”میری اور ثابت کی سمجھ نہیں سکتی۔“
 جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے، اس نے بیان
 کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا یا رسول اللہ جو کچھ

(بقیہ حاشیہ ص ۶۴) اس کی وفاداری اور عظمت و عظمت کے تحفظ کے لیے اللہ اور رسولؐ نے
 دیتے ہیں۔ یہ ایک مومنہ کا تصور ہے کہ حقوق اللہ کے توڑنے کو وہ کفر سمجھتی ہے۔ اور
 آج کل کے مولویوں کا تصور یہ ہے کہ اگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ بھی ادا نہ کیا جائے اور
 کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کیا جائے تب بھی وہ اس حالت کو ایک ایمانی حالت
 کہنے پر اصرار کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور جو اسے
 غیر ایمانی حالت کہے اسے خارجی ٹھہراتے ہیں۔

ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے۔ حضور نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے بعض روایتوں میں خَلَّ سَدِيكَهَا کے الفاظ ہیں اور بعض میں قَارِقَهَا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابو داؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہؓ سے اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے حبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حبیبہ نے آکر حضورؐ سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مالها وقارِقها، اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔

مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو بھی ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مار پیٹ کی نہیں بلکہ بد صورتی کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں حبیبہ سے منقول ہیں، یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اِخْلَعْهَا دَمِيغًا بِتَوَمِنٍ قَدِطَهَا۔ اس کو خلع دے دے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں

کے عوض ہی میں ہو۔

ربیع بنت معوذ بن عمرو نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمانؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا مو بافت تک لے لے اور اس کو خلع دے دے۔ فاجازہ و اصد باخذ عقال و اسہا فنادوتہ

احکامِ خلع :-

ان روایات سے حسبِ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) فَإِنْ خِفْتُمْ الْإِيقِي مَا حُدَّ وَدَّ اللَّهُ كِ تَقْسِيرُهُ تَسْكَيَاتٌ هِيَ جَوَابَةٌ

بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس تَسْكَيَاتِ کو خلع کے لیے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بد صورت ہے۔ اور وہ ان کو پسند نہیں ہے۔ آپ نے ان کو خوبصورتی کے فلسفے پر کوئی لکچر نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل یہی شوہر کی طرف سے نفرت و کراہت بیٹھ چکی ہے تو آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا۔ کیونکہ نفرت و کراہت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج دین اور اخلاق اور تمدن کے لئے طلاق و خلع سے زیادہ خراب ہیں۔ ان سے تو مقاصدِ شریعت ہی کے فوت ہو جانے کا خوف ہے۔ پس نبی

لے کشف الغمہ ج ۲۔

لے عبد الرزاق بجوالہ فتح الباری

صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعی ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے، تاکہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس جوڑے میں اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ ایک معقول بات ہے۔ عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا، لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لئے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں ہے کہ جو وجوہ عورت بیان کر رہی ہے وہ نفرت کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔

(۴) قاضی عورت کو دعوٰی دینا پسند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے۔ اور اگر وہ اس امر کا

اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑے مگر اس خاص مرد کے ساتھ بہر حال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

(۵) خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے متفرق طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالبِ خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدماتِ خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس سوال کی کما حقہ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذواقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذواقیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حق خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے متفقہ نہ ہو جائیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالبِ خلع عورت دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا وہ فی الحقیقت خلع کی جائز ضرورت رکھتی ہوگی۔ یا محض ذواقہ ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو رد کرنا ظلم ہوگا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جو عورت طبعاً ذواقہ ہوگی وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے

اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ بُرا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے نکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

(۶) اگر عورت خلع مانگے اور اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے

گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔ اور قاضی کا حکم بہر حال یہی معنی رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اس کے بجالانے کا پابند ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ بجانہ لائے تو قاضی اس کو قید کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ قاضی کی اگر یہ حیثیت ہو تو لوگوں کے لئے اس کی عدالت کا دروازہ کھلا ہونا محض بے معنی ہے۔

(۷) خلع کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن

کا ہے یعنی اس کے بعد زمانہ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ کیونکہ حق رجوع بائن رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ عورت نے جو مال اس

کو دیا ہے وہ عقد نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے، اس لئے اگر

شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو

شریعت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے

تو کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طلاق منغلظ نہیں ہے جس کے بعد دوبارہ نکاح

کرنے کے لئے تحلیل شرط ہو۔

(۸) خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جیسے معاوضے پر بھی زوجین راضی ہو جائیں اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیئے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے۔ آپ کا ارشاد ہے لَا يَأْخُذُ الرَّجُلُ مِنَ الْمُخْتَلَعَةِ أَكْثَرَ مِمَّا اسْطَاحَا۔ حضرت علی کہم اللہ وجہہ نے بھی بالفاظِ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لئے سرے سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے وَانْ كَانَ النِّسْوُزُ مِنْ قَبْلِهِ يَكْرَهُ لَهُ اِنْ يَأْخُذَ مِنْهَا عَوْضًا۔ ان تصریحات کو دیکھتے ہوئے اس باب میں اصولِ شریع کے تحت یہ ضابطہ بنایا جاسکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خلع کے لئے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں، تو اس کو مہر کے ایک قلیل جز یا نصف کی واپسی پر خلع دلایا جائے۔ اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لئے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے روئے میں قاضی کو ذوقیبت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی

خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت

اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا۔ اور اصولِ شرح کے معاملات، خلع دینے یا نہ دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تانغیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں۔ بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے، وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیتہً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دینا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شہرت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ معاملہ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کئے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی شریعت میں متانوں ازدواج کی بنا ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکستان کی اخلاق اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام

مستحسن اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت ناجھود ہے۔ اور جب یہ تعلق دونوں کے لئے، یا دونوں میں سے کسی ایک کے لئے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے، یا اس میں موڈت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہت داخل ہو جائے، تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملہ منکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقد نکاح کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں حل و عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدہ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دے تو پھر قاضی سے مدد لے۔

زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، اور خدا اور رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے

تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کر دے وہ مجبور ہے کہ بہر حال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لئے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور متناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوتی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟ یہ جسارت اگر کوئی کرے تو اسے اقوال فقہار سے نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول نے خلع کے معاملہ میں قاضی کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات :-

قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ اس کو پھر پڑھیے

فَإِنْ نَحِفْتُمْ إِلَّا يُقِيّمَا حُدُودَ
اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا
فَعَدْتُمْ بِهِ۔

اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ان دونوں (یعنی زوجین) پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کہ علیحدگی حاصل کر لے۔ (بقرہ - ۲۲۹)

اس آیت میں خود زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے لہذا لفظانِ نَحِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں باہمی رضامندی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں خلع پر راضی نامہ نہ ہو سکے تو عورت کو قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب اگر فی الواقع قاضی اس معاملہ میں صرف سماعت کا اختیار رکھتا ہو، مگر مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اور منقول ہوئے ہیں۔ ان سب میں یا تو صیغہ امر آیا ہے جیسے **طَلَّقَهَا** (اسے طلاق دے)، **فَارِقَهَا** (اس سے جدا ہو جا)، اور **خَلَّ سَبِيلَهَا** (اس کو چھوڑ دے) یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ اور ابن جریر نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ **فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا** پھر آپ نے ان کو جد کر دیا۔ اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جلیلہ بنت ابی بن سؤل سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قاضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کر دے تو کیا قاضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں تو ایسی کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی

کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے سرتابی کی جرأت کی ہو۔
 لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں، جس میں آپ
 نے ایک ہیکڑ شوہر سے فرمایا تھا: لَسْتَ بِبَارِعٍ حَتَّى تَرْضَى بِبِئْسَلِ
 مَا رَضِيَتْ بِهِ یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک کہ تو بھی اسی طرح حکمین
 کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوتی ہے۔ اگر تاضی
 ایک شوہر کو حکمین کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو
 وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لئے تو بد رجہ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا
 ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف ایک خلع ہی کا
 مسئلہ ایسا ہو جسے قاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں
 میں متعدد دجزیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر
 اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کر دے۔ پھر کیوں نہ خلع کے
 مسئلہ میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

اگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ
 واضح ہو جائے گی کہ عینین اور مجنوب اور خصی اور جذامی اور مبروص اور مخبون
 شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح
 خیاب بلوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کئے گئے ہیں،
 ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خلع دلانے کے

۱۔ نامرد ۲۔ مقطوع الذکر ۳۔ کوڑھی

پورے اختیارات قاضی کو حاصل ہوں۔ ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں، ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا خودکشی کر لیں، یا اپنے داعیاتِ نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرتد ہو کر قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ضیح مدعا کے لئے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عینین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہم بستری پر قادر ہو گیا، حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت بھی کر لی ہے تو عورت کو نسخِ نکاح کا حق نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لئے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح کے وقت معارضہ تھا کہ وہ نامرد ہے اور پھر وہ نکاح پر راضی ہوئی تو اس کو سہ سے قاضی کے پاس دعویٰ ہی لے جانے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر نامرد ہو گیا تب بھی عورت کو دعویٰ کا حق نہیں ہے۔ اگر عورت کو

لے فی رد المعتار عن المعراج اذا اولج الحشفة فقط تلبس بعینین وان کان

مقطوعاً فلا بد من ایلاج بقیة الذکر

لے فی العالمکیریة ان علمت المرأة وقت النکاح انه عینین لایصل

الی النساء لایکون لها حق الخصومة

لے فی الدر المختار نلوجب بعد وصوله الیهامزاً او صار عینیناً بعد

ای الوصول لایفترق لحصول حقها بالوطی مرتة

نکاح کے بعد شوہر کے نامزد ہونے کا علم حاصل ہو اور وہ اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے تب بھی وہ ہمیشہ کے لئے خیارِ فسخ سے محروم ہو گئی۔ ان صورتوں میں عورت کا خیارِ فسخ تو یوں باطل ہو گیا۔ اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے بچنے کا راز حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع کر لے مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا۔ کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا ہر بلکہ ہر سے کچھ زائد لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے اب غور کیجئے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہوگا؟ بس یہی ناکہ یا تو وہ خود کشی کر لے، یا عیسائی راہبات کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں برداشت کرے، یا قیدِ نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو، یا پھر سرے سے دینِ اسلام ہی کو خیر باد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشا یہ بھی یہی ہے کہ عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے قانونِ ازدواج بنایا گیا تھا؟ کیا ایسے زوجین میں مودت و رحمت ہوگی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدن کی کوئی مفید خدمت کر سکیں گے؟ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے؟ کیا یہ قیدِ نکاح کسی حیثیت سے بھی احسان کی تعریف میں آسکے گی اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا

لے قال الشامی قولہ لم یبطل ای ما لم تقل رضیت بالمقام معہ

تلفظ ہو گا؟ اگر نہیں تو بتایا جاتے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہونے، یا دائرہ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سر ہو گا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے قانون میں ایسا کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

قصائے شرعی :-

طلاق اور خلع کی بحث میں قانونِ اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدہ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدودِ اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تشریح باحسان ہونا چاہیے۔ یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہو جائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو، بلکہ خاندانوں میں نکتے برپا ہوں، سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو، اور آئندہ نسلوں تک ان کے بُرے اثرات متعدی ہو جائیں۔ انہی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تشریح باحسان کے اصول پر عمل کر سکیں۔ لیکن بہت سی ایسی جھگڑا لوں

ہے۔ یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی شریعت میاں اور بیوی کے باہمی

طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کر سکتی ہیں اور نہ تشریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں، نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے، یا امساک بالمعروف اور تشریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیے اور حقوق اللہ کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضا، شرعی ہے۔

و لقیہ حاشیہ ص ۷۹) ججگڑوں کا پبلک میں علانیہ برسر عدالت آنا پسند نہیں کرتی۔ اس لئے اس نے عورت اور مرد دونوں کیلئے ایسے قانونی چارہ کار رکھ دیئے ہیں کہ حتی الامکان گھر کے گھر ہی میں وہ اپنے ججگڑے نمٹالیں۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا بالکل آخری تدبیر ہے جب کہ گھر میں فیصلہ کر لینے کا کوئی امکان نہ ہو۔

قضاء شرعی کے متعلق چند اصولی مباحث

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاء شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔
قضاء کے لئے اذہین شرط

قضاء شرعی کی شرائط میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ عدالت لازماً اسلامی عدالت ہونی چاہیے اور قاضی کو لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہاء نے بتصریح بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اصولی شرع کے تحت شرعی معاملات میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرعی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہو گا اور نہ شرعاً عورت کے لئے دوسرے شخص سے نکاح کہنا جائز ہو گا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہو گا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ رہی دوسری وجہ تو وہ یہ ہے کہ قرآن غیر اسلامی عدالت کے فیصلہ کو اول تو اصولاً تسلیم ہی نہیں کرتا۔ پھر مسلمانوں کے معاملہ میں خصوصاً اس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ان پر عدالت کفر کا حکم اللہ کے نزدیک مستحکم نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مضمون ”ایک نہایت اہم استفتاء“ میں
کہ چکا ہوں، جو اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ لگا دیا گیا ہے۔

قضاء کے لئے اجتہاد کی ضرورت

علاوہ بریں جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے، اگرچہ
ان کے لیے شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں، لیکن شخصی معاملات میں ہر
ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تفسیر، اور
اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط اور روح قانون کے
مطابق نصل خصوصیات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی
میں قوت اجتہاد ہو اور اس کے ساتھ اس کے دل میں اعتقاد اس قانون کا
احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لیے وہ منصب قضا پر مامور ہوا
ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً
مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی اسپرٹ
کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کے اصل ماتخذ پر دست رس رکھتا ہو اور مسلم
سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم
جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں
کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی معاملات کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضا و شرعی نہ ہونے کے نقصانات

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک

لے یہاں پھر اس امر کی توضیح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اصولاً اس قضا و شرعی (باقی صفحہ پر)

مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ ہی سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضاہ منسوخ کر دیا گیا اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزوں کے عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر قضائے شرعی کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکل منقود ہو گئی۔ اور مسلمانوں کے لئے اپنے شرعی معاملات میں عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا ناممکن ہو گیا۔ جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جاسکتا ہو۔ دوسرا نقصان جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہوا کہ ان عدالتوں کے حکام کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے قانون اسلامی کے اصول و فرسوع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے معنی میں کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف محققین۔ مثلاً ہاملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے

(رقیبہ نمبر ۸۲) کی صحت کا معتقد نہیں ہوں جو غیر اسلامی حکومت کے اذن سے قائم ہو مگر اس پر سبیل تنزیل وہ صورت بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے اسلامی حکومت قائم ہونے تک ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی معاملات بدرجہہ آخر درست ہو سکتے ہیں۔

اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کئے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور بیلی (Baillie) جس کا ڈائجسٹ آف محمدن لا

(Digest of Muhammadan Law) فتاویٰ عالم گیری کے

اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے اور مکیناٹن (Macnaughton)

جس کی کتاب پرنسپلز آف محمدن لا (Principles of Muhammadan

Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی

ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں۔ چنانچہ جسٹس مارکبی ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے۔

”شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ

اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے

مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی

آنا دہ ہوں۔“

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے

کی جرات کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا،

کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے اور نہ حکومت مقتصدہ

کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس

قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارنر

لے خواجہ حسین بنام شہزادی بیگم۔ لے ملک عبد الغفور بنام ملیگا۔

نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

”قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے، اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات ہیں، جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں، حتیٰ الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اول تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں تطبیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آتے ہیں۔ اس لیے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جس پر کوئی حکم مبنی ہو اور پھر قواعد الصدا، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔“

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی نزواقیت کا معترف ہے اور اختلافاتِ ائمہ میں تطبیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین میں اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو غلامیہ جائز ٹھہراتا ہے اور اسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر

کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا ایمان و علم کا نتیجہ ہے کہ جو اُدھورا اور ناقص قانون محمدن لار کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے، اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم

پس معاملاتِ نکاح و طلاق اور دوسرے شرعی معاملات میں صحیح فیصلے حاصل کرنے کی کم سے کم اگر کوئی صورت اس وقت ممکن ہے تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک میں تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) حاصل ہو اور اس کے تحت مسلمان اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے خود اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔ اور ان محکموں میں ایسے متقی علماءِ قاضی کی حیثیت سے مقرر کئے جائیں جو قانونِ شریعت میں فقیہانہ بصیرت رکھتے ہوں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقت میں مسلمان کے لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہاں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ اور اگر یہ چیز بھی انہیں

حاصل نہ ہو تو برسرِ پیل تنزل اتنا ہی سہی، اور یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہے کہ مذہبِ مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر حکومتِ مستبدانہ پر دباؤ ڈال کر اس سے یہ منوالیا جائے کہ مسلمانوں کے معاملاتِ نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی، اور انگریزی عدالتوں میں ان کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی، اور خود انگریزی عدالتوں میں جو مقدمہ نکاح و طلاق وغیرہ پیش ہوں گے ان کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان مسلمان ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرہ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاحِ معاملات کے لیے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچائتی سسٹم قائم کر کے اس کو ان ریاستوں سے تسلیم کر لیا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو مجالس وضع قوانین میں کسی مسودہ قانون کو پیش اور

اے حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضا و قضائے کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ پنچائتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیاراتِ سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکیانہ نوعیت کے ہوں تو مذہبِ حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضا و شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

پاس کر لینا اسلامی اغراض کے لئے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت

انتظامِ قضائے شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے۔ اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعتاً کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے تاکہ محاکم شرعیہ یا پنچائتوں میں موجودہ انگریزی محڈن لار کی جگہ اس کو رواج دیا جاسکے۔ مصر میں جب مخلوط عدالتیں (Mixed Tribunals) قائم کئے گئے تھے، تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومتِ مصر کے ایما سے قدوسی پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے چیدہ چیدہ علماء چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں۔ اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودے کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء

۱۔ اس مجموعہ کا ترجمہ فرینچ زبان میں (Droit Mussalman) کے نام سے

شائع ہو چکا ہے۔ اور مصر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کو عدالتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کی رائے دریافت کی جائے۔ پھر ان آراء اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے۔ اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو اسے احکام شرعیہ کا مستند مجموعہ قرار دے کر یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انگریزی عدالتوں کے نظائر اور غیر اہل علم و ایمان حجتوں کی تشریحات سے جو محمد بن لار تیار ہوا ہے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

کہا جاسکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں ہے بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرورت مخالفت کی جائے گی۔ اس لئے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضرور ہے۔

یہ بات تو ہر سری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرز بیان و انداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں، اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاحی باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کا درس دیتے ہیں۔ آج کل قانون کی کتابوں میں جس طرح احکام کو دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے اور پھر ہر دفعہ کے نیچے اس کے خاص خاص الفاظ کی تشریح، اس کے مقصد کی توضیح، اس کے تحت آنے والے جزئیات کی تفصیل دی جاتی ہے، اور معتبر حکام کے نظائر اور مختلف ماہرین کی تعبیرات جس طرح منقح صورت میں درج کی جاتی ہیں، اور فہرستوں اور انڈیکسوں سے مسائل کے تلاش کرنے میں جو آسانیاں ہم پہنچاتی جاتی ہیں،

ان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ انسانی کوششوں سے تدوین و ترتیب کے فن میں یہ جو ترقی ہوئی ہے اس سے کتب فقہیہ کی تدوین جدید میں ضرور کام لیا جانا چاہیے۔ آخر قدیم طرز تدوین کوئی مخصوص اور مشروع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ:

اولاً جس اسلامی معاشرے میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کے اخلاقی، تمدنی معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں، وہ کس ماحول میں رہتے ہیں، اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں، ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات، اور ان کے طبقہ کی عام حالت، سب پر نگاہ ڈال کر راستے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے

جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے اور اصولِ قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزیئہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزیئہ سے تعلق رکھتا ہو، چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے الگ الگ مزاج اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کیے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ تھے، مگر وہ اس لیے کب مرتب کیے گئے تھے کہ جاہل غطار ان کو برتیں۔ انہیں استعمال کرنے کے لئے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوچ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمہ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جہتی مسائل مستنبط کیے ہیں وہ بھی اپنی جگہ نہایت درست تھے لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقہ اور تدبیر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا، جیسے بڑا اک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چیرا سی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے تحت کسی مرد یا عورت کا مجبوراً بد اخلاقی میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجبِ فتنہ و فساد بن جانا قریب قریب محال تھا۔ اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرہ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن آج ہم

دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفسد
حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس ذبحہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر مقدمات
میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لیے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال
ہو گیا ہے۔ تفقہ اور تدبیر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں۔ ان میں سے
کوئی بھی نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک، جس سوسائٹی اور جس خاص مقام
میں نافذ کر رہے ہیں، اس کی کون کون سی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس حکم کے عموم
میں اصولی شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ شریعت کے
مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے، اور اس کے اصول میں سے کسی
اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ چہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے، ان کی
محدوری تو ظاہر ہے۔ رہے علماء تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد
ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے
ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں اور بعض کو اگرچہ
اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے لیکن فرداً فرداً ان
میں سے کسی میں بھی ایسی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم
جزئیہ کی عبارت سے ہلکے بھر بھی انحراف کر جائیں۔ کیونکہ ایک طرف خود نہیں
اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری
طرف یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت
کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبہ کے جلیل القدر
اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اجتماعی قوت و اثر

سے کام لے کر شرعی معاملات کے لئے ایسا ضابطہ مرتب کرے جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ اخلاقی، تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو۔ اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جاسکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو غیر مقلدیت قرار دیتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ عقلی پرست ہے وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلہ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلہ نبی اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح، ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہِ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانہ اجتهاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا، مگر اس کے بعد حرام ہو گیا ہے لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ خفیت سے خارج نہ ہوئے۔ علماء احناف نے امام اعظم رح اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک

کر کے بعض کو مفتیٰ اور قرار دیا۔ مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علماء احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور حسبِ ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذاہب سے مسائل اخذ کر کے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابواللیث سمرقندی، شمس اللامۃ سمرخسی، صاحب ہدایہ، تاضی خاں، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو نفس اس بنا پر غیر مقلد کہہ دے کہ انہوں نے مذہبِ حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی، اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجبِ ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابلِ عمل پایا، ان میں دوسرے مذاہبِ فقہیہ کے مطابق فتویٰ دیا، اور اس بات کو مذہبِ حنفی کے اصول میں داخل کر لیا کہ بوقتِ ضرورت مذہبِ غیر پر حکم اور فتویٰ دینا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں اتبارع ہوئی نہ ہو۔

اس میں شک نہیں اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے خواہشات کی پیروی، مختلف مذاہب نے اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے جو رخصتیں خاص خاص حالات میں دی ہیں ان سے نفع

لے خواہشِ نفس کی پیروی

گیری، اور دین کے ساتھ مذاق کا دروازہ کھل جائے گا، اور معاملات میں سخت ابتیری پیدا ہوگی۔ لیکن اگر علماء دین، تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کر کے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی ہی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا اجر ان کو دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنے میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانونِ اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور انہیں تلاعب بالذین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی اور کفر و معصیت کی وبا پھیلے گی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کر لیں گے تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی

یہ دین کا مذاق بنانا اور مسائل دین سے کھیلنا
 لٹ جیسا کہ وہ شرکی ہیں کر چکے ہیں۔

یہ تھی کہ تم اس کو یسے علیحدے رکھو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کتزالدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لیے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل مبحث کی طرف رجوع کریں گے۔

اصول کی ہدایات

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے۔ اس لیے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کے استنباط میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کر و جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔	﴿لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا﴾ (لقہ ۲۳۱)
مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نکاح نہ کر و جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔	﴿وَلَا تُنْكَحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يَرْمَنُوْا﴾ (لقہ ۲۳۲)
اور حلال کی گئیں تمہارے لئے اہل کتاب میں سے وہ عورتیں جو محفوظ ہوں۔	﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اَوْلَتْهُنَّ الْكِتٰبُ﴾ (المائدہ ۵)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرکہ عورت سے نہیں ہو سکتا، البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

مشرك عورتوں سے نكاح نہ كرو.....
..... مشرك مردوں سے اپنی
عورتوں كے نكاح نہ كرو۔

(۲) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ
..... وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ
(لقبرہ - ۲۲۱)

اس كے بقاعدہ بھی معلوم ہوا كہ مرد تو اپنا نكاح خود كہ لینے كا مختار ہے۔ لیكن عورت اس معاملہ میں بالكل آزاد نہیں ہے۔ اسے كسی كے نكاح میں دینا اس كے اولیاء كا كام ہے۔ اس میں شك نہیں كہ حدیث الْأَيْمَانُ حَقٌّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَ لِيَّهَا اور لَا تُنْكَحُ الْبِكْرَ حَتَّى تُسْتَأْذِنَ كِ رُو سے نكاح كے لئے عورت كی كھنامندی ضروری ہے، اور كسی كو اس كی مرضی كے خلاف اس كا نكاح كہ دینے كا حق حاصل نہیں۔ مگر چونكہ عورت كے نكاح كا مسئلہ خاندان كے مفاد سے ایک گہرا تعلق ركھتا ہے، اس لئے قرآن مجید یہ پابھتا ہے كہ شادی كے معاملہ میں تنہا عورت كی پسند اور خواہش كافی نہ ہو بلکہ ساتھ ساتھ اس كے رشتہ دار مردوں كی رائے كو بھی اس میں دخل ہے۔

پس جو فائدہ تم نے ان سے اٹھایا ہے اس كے بدلے ان كے مہر ادا كرو۔ ایک فریضے كے طور پر۔

(۳) رَبَّنَا اسْتَمْتَعْنَا بِه
مِنْهُنَّ فَاَتُوهُنَّ اَجْرَهُنَّ فَرِيضَةً
(النساء - ۷۲۳)

اور تم اپنا دیا ہوا مہر ان سے کیسے چھین لو گے جب كہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چكے۔

وَ كَيْفَ تَأْخُذُوْنَ مِنْهُ وَ قَدْ
اَنْضٰ بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ -
(النساء - ۲۱)

اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے اور مہر مقرر ہو چكنے كے بعد ان كو طلاق دی ہو تو

وَ اِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تَمْسُوهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

فَرِيضَةً فَنِصْفٌ مَّا فَرَغْتُمْ
اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا نصف دینا
(لقرہ - ۲۳۷) ہوگا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اس فائدہ کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی
کی مقاربت سے حاصل کرتا ہے۔ لہذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا
ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ عورت یا اپنی خوشی سے
پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ معاف کر دے۔ (فَإِنْ طَبِنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ
لَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ)

(۲) وَآتَيْتُمْ أَحَدًا مِّنْهُنَّ
اور اگر تم نے ان کو مہر میں ڈھیر سا مال
بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس
نہ لو۔
(النساء - ۲۳)

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں
کی گئی ہے۔ لہذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى
مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس وجہ سے کہ
النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى
ان میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے
بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ
فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ وہ ان پر
(النساء - ۳۴) اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجب حق ہے اور یہ ان حقوق زوجیت
کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق

کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز (سرکشی) کی ترکیب ہو۔

(۶) لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ
سَعِيهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ
فَلْيُفْسِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ - (الطلاق - ۷۰)

خوشحال آدمی اپنی خوشحال کے مطابق نفقہ دے
اور جس کا رزق نپاٹا ہوا ہے اللہ نے بتنا
کچھ دیا ہو اسی میں سے وہ خرچ کرے۔

یہاں نفقہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کے تعین میں مرد کی استطاعت
کا لحاظ کیا جائے گا۔ مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے۔ اور
غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے۔

(۷) وَاللَّتِي تَخَافُ مِن نُّشُوزِ
هُنَّ فَعِظُوهُنَّ فَإِذَا هُنَّ فِي
الْمُضَاجِعِ وَأَضْرِبُوهُنَّ مِثْلَ
أَطْعَمِكُمْ وَلَا تَبَغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا
(النساء - ۳۴)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو
ان کو نصیحت کرو، اور خواب گاہوں میں
ان سے الگ رہو اور ان کو مارو پھر اگر وہ
تمہاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کرنے
کے لئے بہانے نہ ڈھونڈو۔

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے
جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے اور اس صورت میں بھی
سزا کی صورت دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجرت یعنی ترک صحبت دوسرے
ضرب غیر مبرح۔ یعنی ہلکی مار جو صرف انتہا درجہ کے نشوز میں جائز ہے اس حد سے
تجاوز کرنا، یعنی بغیر سرکشی کے سزا دینا، یا کم درجہ کی سرکشی پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی
سرکشی پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

اور اگر تم لوگوں کو اندیشہ ہو میاں اور بیوی کے درمیان ناچاقی کا تو ایک بیچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بھیجو۔ اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔

(۸) وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (انساء - ۳۵)

اس آیت میں یہ تاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو تو برسرِ عدالت ان کے جھگڑے نمٹائے جانے سے پہلے یہ تدبیر کر لینی چاہیے کہ ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بطورِ حکم مقرر کیا جائے اور دونوں مل کر ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اس لئے حاکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار بھی اولی الامر ہی کو حاصل ہے۔

پھر اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں میاں بیوی حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت تدبیر سے کر علم کی حاصل کر لے۔

(۹) فَإِنْ خِفْتُمْ الْإِيقِيًّا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ -

(بقرہ - ۲۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت

تقاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے اور اس کے لئے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جاسکتی ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوا هُنَّ ضِرَارًا

اور ان کو ضرر کی خاطر نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی نہ کرو۔ (بقرہ ۲۳۴)

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے۔ (وَنَامِسَاتٌ مِّنَ الْمُعْرُوفِ) مگر جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ حسب ارشاد نبوی، اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے۔ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ وَتَمَتَّتْ

الْإِسْلَامِ۔

بس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا أَكْلَ الْمَيْلِ

پڑو کہ دوسری کو گویا لٹکنا چھوڑ دو۔

فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء-۱۲۶)

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لئے نازل ہوئی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدے کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے۔ یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کہ لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲۱) لِيَذِينَ يُؤْتُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ
 هَذَرْتُمْ لَبِئْسَ مَا تَشْتَرُونَ (لقبرہ: ۲۲۶) ان کیلئے چار مہینے کی مہلت ہے۔

اس آیت میں عورت کی اوسط قوت برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی چار مہینے تک وہ قنزل اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خون ہے اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳۶) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ (الآیہ - النور - ۶)

اس آیت میں لیعان کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر

لے اسی قاعدہ کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شادی شدہ شخص مسلسل چار مہینے سے زیادہ مدت تک فوجی خدمت پر گھر سے دور نہ رکھا جائے۔

ذَمَّةُ (الطلاق - ۱) لہذا جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (بقرہ - ۱۷۹) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبے میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ، اگر اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں، یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ تاضی کو نسخ اور تفریق اور تطبیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہاء کی ایک جماعت نے بیدار عقائد النکاح سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں تاضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں تو آدمی کا حق حیات تک إلا بالحق کے ساتھ مشروط ہے کجا کہ اس کے حق طلاق کو ایسا مطلق

۱۔ نکاح توڑ دینا

۲۔ میاں بیوی کو جدا جدا کر دینا

۳۔ طلاق کا اختیار شوہر سے سلب کر کے با اختیار خود عورت کو طلاق دے دینا۔

مانا جائے کہ خواہ وہ ظلم کرے، اللہ کی ساری حدیں توڑ دے، اور دوسرے فریق کے سارے حقوق ضائع کر دے، پھر بھی اس کا یہ حق بلا قید و شرط ہی برقرار ہے۔

اطلاق دوبارہ ہے۔ پھر یا روک رکھا جائے

بھلے طریقے سے یا رخصت کر دیا جائے

احسان کے ساتھ

پھر اگر مرد اس کو (تیسری بار) طلاق دیدے

تو وہ اس کیلئے حلال نہ ہوگی۔ جب تک کہ

اس کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو۔

(۱۵) الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ

فَاِمْسَاكٌ بِمَحْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ

بِاِحْسَانٍ۔ (بقرہ - ۲۲۹)

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ

لَبَدِّ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا ۗ

(البقرہ - ۲۳۰)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ

کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی منغلظہ۔

مسائل جزئیہ

پچھلے باب میں اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک ایک اصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جن میں ضروریات و حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے ازسرنو احکام فقہی کی تصریح و توضیح ضروری ہے۔

ازتداوا الزوجین

موجودہ زمانہ میں ازتداو کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے جہاں تک مرد کے ازتداو کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ازتداو کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہو گئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لئے مرتد ہو گئی ہیں اور ہوسپی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے زندگی گزاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی: **ازتداوا احد الزوجین وقت الفرقة بغیر طلاق۔** جب زوجین

میں سے کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن علماء ہند اس قسم کے ازداد کی رو کو روکنے کے لئے مشائخ بلخ و سمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ازداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مرتد بن جاتی ہے اس لئے اس حیلے کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ازداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید ان علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی۔

اولاً اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی۔ بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوتی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجہ آخر وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ سے فائدہ اٹھا کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔ مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے اس کا مسلمان مرد کے نکاح میں رہنا

لے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر تو حرام ہو جاتی ہے۔ مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکے۔

تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً جو عورت اسلام کے دائرے سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے، اس کی مرضی کے خلاف اسی نکاح پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرے گی جو اس سے بحالت اسلام اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلے میں مشائخ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علماء کو کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فیصدی ایسی ہوں گی جن کے عقیدے میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں راجح الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لئے وادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے۔ مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بے ہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں، مگر نیک نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود و الجبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت

عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال نکال کر لائے جائیں تاکہ ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لئے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کے آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے جہاں تک اللہ اور رسول کے مخصوص احکام تک کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لئے موجب ضرر ہی ہو کجا کہ موجب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے، اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اختیارِ بلوغ

قرآن مجید میں اگرچہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدے کی جو تعبیر فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بالکل ہی بے اختیار ہے۔ بخلاف اس کے حضور ص نے ایجاباً عورت کو یہ حق

دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضا مندی حاصل کی جاتے۔ چنانچہ ابو داؤد و نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباسؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کجلائی میری شادی کر دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنساہ بنت خدام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا۔ حضورؐ نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ وارثی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضورؐ نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کر دی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بیٹے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضورؐ نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے دکرے۔ اس پر اس نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا ہے اسے
 میں نے منظور کیا۔ میرا مقصد تو صرف عورتوں
 کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں
 مختار نہیں ہیں۔

مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی اور مؤطا میں حضورؐ کا ارشاد ہے۔

الا لیسوا حق بنفسها من شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے بڑھ کر

اے لغت میں ایچم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔ مگر یہاں

اس سے ثیبہ مراد لی گئی ہے۔

ولیتھا والیکر تستان فی
 اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق
 رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے
 نفسہا۔

معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

لا تنکح الایم حتی
 شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب
 تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے
 اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ
 اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔

۳۔ ولایتِ اِحبار

اوپر جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں
 کہ اصول شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی رضا مندی
 ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا کوئی ولی
 کر دے تو کیا اس صورت میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی
 کا دخل ہو، ساقط ہو جائے گا؟ اس مسئلے میں ہمارے فقہانے یہ فتویٰ دیا ہے کہ
 اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا
 کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا
 دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا۔ الا یہ کہ باپ دادا کا سببی الاختیار ہو نا ثابت
 ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ فاسق یا بے حیا ہے۔ یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور

ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہے۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر جابرانہ حق حاصل ہے، اور ان کے کیے ہوئے نکاح کو لڑکی بالغ ہونے پر نا منظور نہیں کر سکتی، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ محض فقہاء کے اس قیاس پر مبنی

اے ملبسوط میں امام شمس نے لے دے کہ صرف ایک حجت پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بحالت نابالغی کیا تھا۔ پھر جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بالغ ہوئیں تو حضور ص نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں اس نکاح کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے، حالانکہ اگر نابالغہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا تو جس طرح قرآن مجید کی آیت تخییر نازل ہونے پر آپ نے ان کو اختیار دیا تھا اسی طرح اس معاملے میں بھی ضرور اختیار دیتے (المبسوط ج ۴ ص ۲۱۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ولایت اجبار کے حق میں بڑی تلاش کے بعد بھی اس کمزور دلیل کے سوا کوئی دلیل کتاب و سنت سے نہیں لائی جاسکی ہے۔ اور یہ دلیل اتنی کمزور ہے کہ ہمیں شمس الائمہ شمس جیسے شخص پر حیرت ہے کہ انہوں نے کس طرح اتنے بڑے ایک اہم مسئلے کی، جس کا اثر بے شمار عورتوں سے ہمیشہ کے لیے ایک حق مسلوب ہو جانے کی شکل میں مترتب ہوتا ہے، اس دلیل پر بنا رکھنے کو درست سمجھا۔ یہ کہنا کہ حدیث اس کی رو سے باپ کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہے، اگر صحیح ہو سکتا تھا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالغ ہو کر اپنے والد کے کیے ہوئے نکاح کو نا منظور کیا ہوتا۔ یا اس کے مقابلہ میں خیار بلوغ (باقی صفحہ ۱۱۴)

ہے کہ باپ دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لڑکی پر ان کا کیا ہوا نکاح

و لقبہ حاشیہ ص ۱۱۳) استعمال کرنے کا حق مانگا ہوتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ جواب دیا ہوتا کہ نہیں، اب تمہیں یہ حق نہیں رہا، کیونکہ تمہارا نکاح نابالغی کے زمانے میں تمہارے والد نے کیا تھا۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی روایت میں یہ تک مذکور نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالفاظ صریح یہ کہا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں دیا۔ سارے استدلال کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر رکھی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دینا چونکہ کسی روایت میں نہیں بیان ہوا ہے لہذا یہ فرض کیا جائے گا کہ آپ نے ان کو اختیار نہیں دیا، اور چونکہ آپ نے ان کو اختیار نہیں دیا لہذا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسی لڑکی کو اختیار کا حق حاصل ہی نہیں ہے۔

اس بودی دلیل کو پیش کرتے وقت شمس الائمہ کو نہ تو یہ یاد رہا کہ کسی واقعہ کا روایات میں مذکور نہ ہونا اس واقعہ کے پیش نہ آنے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ انہیں یہ خیال آیا کہ جو لڑکی بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کے فعل پر راضی تھی، جس نے اس پر کسی نارضا مندی کا اظہار نہیں کیا تھا، جس نے باپ کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کرنے کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کیا تھا، اگر اسے خیار نہیں دیا گیا تو آخر یہ اس بات کی دلیل کب بن سکتا ہے کہ باپ کے مقابلہ میں لڑکی کو خیار بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسی دلیلوں سے اگر حقوق سلب ہونے لگیں تو ایک شخص یوں بھی استدلال کر سکتا ہے کہ چونکہ فلاں موقع پر فلاں شخص کو (جس نے پانی سرے سے مانگا ہی نہ تھا) پانی نہیں دیا گیا، اس لیے (باتی ص ۱۱۵ پر)

لازم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

فَلَا خِيَارَ لَكُمَا بَعْدَ بَلُوغِهِمَا لِأَنَّهَا كَامِلَاتُ النَّهْيِ

وَأَمَّا الشَّفَقَةُ فَيَلْزِمُ الْعَقْدَ بِمَا شَرْتَهُمَا كَمَا إِذَا بَاشَرَا

بَرُضُهُمَا بَعْدَ الْبُلُوغِ۔

لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اولاً حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کسی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴) کسی کو پانی نہیں دیا جانا چاہیے۔

اس سے بھی عجیب تر شمس الائمہ کا یہ استدلال ہے کہ اگر لڑکی کو باپ کے مقابلے میں خیار بلوغ حاصل ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضیٰ کی طلب کے بغیر بھی ان کو یہ خیار ضرور دیتے، کیونکہ آیت تخییر کے نزول کے بعد آپ نے ان کو خیار عطا کیا۔ دوسرے الفاظ میں شمس الائمہ کا استدلال یہ ہے کہ جو کام ایک معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہی کام ایک دوسرے معاملے میں بھی آپ ضرور کرتے در آنحضرت ایک اس معاملے میں اللہ نے آپ کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔

علماء کو ہم چاہتے ہیں کہ ایسی کمزور باتیں محض اس دھونس کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے مان لی جائیں کہ جو انہیں نہ مانے گا اس پر غیر مقلدیت کا ٹھپالگا دیا جائے گا۔

قبول کرنے کا اختیار ہے۔ اس حدیث سے نابالغہ کے لئے خیاب بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں، اس لئے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو، لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا حق کلیتہً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ اگر کسی کے "کامل الرائے اور وافر الشفقت" ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہو سکتی ہے تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اس کے لئے ثابت کی جاتی ہے۔ لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟ ثالثاً، باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کر لیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں، جن سے وافر شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا ایک یقینی کے ساتھ وافر شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں، اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کیچھت نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے،

تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں، اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کسنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں اور بُری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت باپ دادا کی ولایتِ اجبار خود ان کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سستی اختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیارِ بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو برسرِ عدالت اپنے باپ دادا کے خلاف بد نیتی، فسق و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر اور حماقت و بلاوت کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔ اور یہ اس کے لئے نہ صرف مشکل ہے بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزیئہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو بہر حال میں خیارِ بلوغ دیا جائے۔

۱۔ ہم نے نابالغ لڑکے کا مسئلہ یہاں اس لئے نہیں چھیڑا کہ اسے پھر بھی طلاق کا

چارہ کار حاصل ہے۔

۴۔ خیاری بلوغ کی شرائط

اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محلِ نظر ہے۔ بابِ اِرا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیاری بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضا مندی کا اظہار کر دے۔ اگر پہلے حیض کا خون نمودار ہوتے ہی اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیاری باطل ہو جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ شرط صرف باکرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔ یتیمہ اور نابالغ لڑکے کے لئے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کرے میں ان کو خیاری نسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرہ نابالغہ کے لئے رکھی گئی ہے، اس کا ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیاری نسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب

لے شوہر و بیوہ عورت۔ اگر کوئی لڑکی بالغ ہونے سے پہلے مرد کی صحبت سے آشنا ہو چکی ہو، خواہ بصورت نکاح یا بصورت زنا، تو وہ بھی یتیمہ ہی کہی جائے گی۔

رو نما ہو جانا ہو اور انا فانا اس میں راستے قائم کرنے کی صلاحیتیں ابھرا آئی ہوں۔ تاہم مان لیا جائے کہ ایسا ہوتا ہے تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیال بلوغ کو اس وقت تک کے لئے متذکرین گیا ہے جب تک کہ وہ ٹوٹا یا نعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کر دیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آخر باکرہ ہی کو کیوں سوچنے سمجھنے اور راستے قائم کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا جائے؟ ایک نا تجربہ کار و شیرازہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ نا تجربہ کار ہوتی ہے۔

۵۔ مہر

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لئے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کر لی چاہی تھی۔ مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت **وَ اتَّيْتُمْ اِحْدا هُنَّ قِنْطَارًا اَفَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا** کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا:۔

امْرَاَةٌ اَصَابَتْ رَجُلًا اَخْطَاً - ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا۔

اے اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے تم کچھ واپس نہ لو۔

پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

النِّسَاءُ وَالنِّسَاءُ الرَّجَالُ وَلَا

عزرتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش

تغالیٰ المهورا

کہ و اور جہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمر والاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا

لَوْ كُنْتُمْ تَعْرِفُونَ الدَّرَاهِمَ مِنْ أَدْرِيْتِكُمْ مَا ذَرَبْتُمْ ۗ اِگرم کوندی نالوں

میں درہم پہنتے ہوئے ملتنے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے۔ حضرت

انس رضی نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۶) درہم پر نکاح کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔

تَنَحْتُونَ الْفِضَّةَ مِنْ عَرْضِ هَذَا الْجَبَلِ۔ گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی

کھود کھود کر نکال رہے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے

نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں کوئی قابلِ عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم

سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے۔ مگر آپ کی ازواج اور

صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر بھی بارہ اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام

ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی ستاؤں میں

مہر موٹیل کے طور پر لکھ دی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے

لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں

کہ کبھی ان کو یہ مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لئے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرہ صریح فرمایا ہے کہ:-

من تزوج امرأة بصدق
بنوی ان لا یودیہ خذوا من دین
آذان دینا یشوی ان لا یقضیہ
خو سارق۔

جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے
نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ
کرے گا وہ دراصل زانی ہے اور جس نے
قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا
کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں۔ اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ

لے اس حدیث سے مہر کے معاملہ کی جس اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے، ظاہر ہے اس بنا پر میں ایسے تمام لوگوں کو جن کے مہر عام رسم کے مطابق ان کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ باندھے گئے ہوں، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی بیویوں کو مہر میں اس حد تک کمی قبول کرنے پر راضی کریں جسے وہ بیک مشمت یا باقسط ادا کر سکتے ہوں اور نیک بیویوں کو بھی میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کمی پر راضی ہو جائیں۔ نیز ہر خدا ترس مسلمان کو بار مہر سے سبکدوش ہونے میں حتی الامکان جلدی کرنی چاہیے۔ مہر ایک قسم کا قرض ہے اور اپنے ذمہ جان بوجھ کر یا بے پروائی کے ساتھ قرض چھوڑ کر مہر جانا اتنی بُری بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا ہے۔

دے سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لئے بلا تے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالاش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لئے وہ غریب معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے، ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتنا جائے تو قریب قریب ۵ فیصدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لئے اصول شریعہ کی خلاف ورزی نہ سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مہر اگر معجل ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں۔ لیکن اگر وہ مؤجل ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر مؤجل کا یہ سترتا پابعد طریقہ باسانی مسدود ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائیداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر

لے جو فوراً ادا کیا جائے۔

۲۔ جو ایک مدت کے بعد ادا کیا جانا ہو۔

دیں۔ حالات کے ردِ باصلاح ہو جانے پر یہ شرط اڑائی جاسکتی ہے۔

۶۔ نفقہ

اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی تو استنطاق عنت رکھتا ہو، مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استنطاق عنت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر مجبور

طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس

میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ

ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے۔ خواہ

شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد

لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود

طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو

اختیار کرنا پسند کیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی

ہو۔ یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو

جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رو سے

نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ ہی میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت

حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو

تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقدِ نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور

کیا جائے پھر لے کر اس کا بدل اور مال لے کر اس کی قیمت ادا کرنے سے جو شخص انکار

کردے وہ آخر اس چیز اور اس مال کا مستحق کیسے رہ سکتا ہے؛ جب تک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے، یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے، یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصولِ قرض کی غیر ملکن الحصول کو شمش کرنے کی تکلیف آخر کس اصول انصاف کی بنا پر دی جائے؟

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں اور امام احمد کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وَجَّاهَا نَفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ میں بیان کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وارثی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے حضرت علیؑ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے

سعید بن مسیبؓ کا بھی یہی فتویٰ ہے اور حضرت عمرؓ ابن عبدالعزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَنْ قُدِرَ حَكْمُهُ رِزْقًا فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يَكْفِ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهُ الْوَالِدَانِ (جس کو نیا تلا رزق دیا گیا ہو اس کو اپنی اسی استطاعت کے مطابق نفقہ دینا چاہیے جو اللہ نے اُسے دی ہے۔ اور کسی متنفس کو اس سے زیادہ کئی تکلیف نہیں دیتا جس کی قدرت اس نے اسے عطا کی ہو۔ لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لئے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور ایک شریف خاتون کو ایذا بھی ہونا چاہیے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے، تو نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانونِ اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے بلند مقام پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلے میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب

امام مالک کا ہے، جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

۶۔ شتم ناروا

آیتِ کریمہ وَالَّتِي تَخَافُونَ كُفْرًا فَهِيَ نَجِسَةٌ وَهِيَ نَجِسَةٌ
فِي الْمَضَاجِعِ وَافْسُرْ كِبْرَهُنَّ فَإِنِ اطَّعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ

سَدِيدًا۔ (النسارہ - ۱۳۴)

کی رُو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزار جسمانی ہو یا آزار لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے۔ اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانونِ اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت اور ناقابلِ برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود لائسنس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ مار پیٹ اور گالم گلوچ کی عادت کو خلع کے جائز اسباب میں شمار کیا جائے اور ایسی عورتوں کو بلا معاوضہ خلع دلویا جائے جن کے شوہروں کی اس عادت کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔

تَحْکِیْم

اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَاْتَبِعُوا اَحْکَامًا مِّنْ اَهْلِيْهِ وَ اَحْکَامًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں۔ پھر دونوں حکموں کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔ پھر عورت سے دریافت فرمایا کیا تو ان دونوں بچوں کے فیصلہ پر راضی ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا، اس نے کہا اگر وہ ملا دیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کَيْسَ ذَا لِكَ لَكَ لَسْتَ بَبَارِحَ حَتّٰی تَرْضٰی بِمَثَلِ مَا رَضِيتَ بِهٖ۔ تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو، تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا نسبتاً اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں ایسی چند دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقے اور حکیم کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔ اسلامی قانون میں یہ ایک بڑی قیمتی چیز

ہے کہ خانگی جھگڑوں کو حتی الامکان کھلی عدالت میں لانے سے پرہیز کیا جائے، اور اگر عدالتوں میں ایسے معاملات آئیں بھی تو حاکم عدالت ان کی تحقیق اور ان کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں خاندانوں کے ذمہ دار افراد سے اس گتھی کے سلجھانے میں مدد لے۔ اس تجویز کو معاشرتی زندگی کے لئے ایک رحمت سمجھنا چاہیے۔

۹۔ عیوب میں خیارِ فسخ

عیوبِ زوجین کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوتے ہیں۔ ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دوسرے فریق کو خیارِ فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے وَلَا يَتَخَيَّرُ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ بَعِيْبَ الْآخَرِ وَلَا حَشَا جَنُونٍ وَحَيْذًا مِنْ بَرَصٍ وَرَتَقٍ وَقَوْنٍ مِثْلًا بِرِيٍّ فِي مِثْلٍ مِثْلًا جَنُونٍ - جَذَامٍ - بَرَصٍ - رَتَقٍ أَوْ قَرْنٍ - صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعود اور ائمہ مجتہدین میں سے عطاء بن یحییٰ، عمر ابن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری و ابو حنیفہ، اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراضِ جبیشہ، اور شرم گاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

لے خیارِ فسخ، یعنی نکاح ہو جانے کے بعد یہ کہنے کا اختیار کہ مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔

چنانچہ ابن جزئی نے القوانین میں عیوب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا كان في أحد الزوجين أحد العيوب كان الآخر الخيار في البقاء معه والفرق! اگر ان عیوب میں سے کوئی عیب عورت یا مرد میں ہو تو فریق ثانی کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ رہنا قبول کرے یا الگ ہو جائے۔

امام شافعی کے نزدیک جنون اور جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مگر قروح سیالہ فرج، مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارش میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو، جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عینین، یا مقطوع الذکر ہو، تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیارِ فسخ ہے۔

امام محمد کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیارِ فسخ نہیں ہے مگر اس کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیارِ فسخ ہے۔ ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظِ اخلاق، دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔

۱۔ وہ زخم جن کی وجہ سے فرج سے رطوبتیں بہتی رہیں۔

پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ بات اسلامی قانون ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لئے مہرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیارِ فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہنچانے والے ہیں۔ اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لئے خیارِ فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو، اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضا مندی کا اظہار کر دیں۔ یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیارِ فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے پاس تو ایک چارہ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے، یعنی طلاق اور اس کے علاوہ دوسرا چارہ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا۔ مگر عورت کے لئے بعض صورتوں میں فقہانے کوئی چارہ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاویٰ ہیں، ان کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے۔

* اے عینین و محبوب و غمیرہ

اگر شوہر محبوب ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کرنے کا دعویٰ کرنے کا حق ہے، اور تحقیقِ حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی بنا پر اسے ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر وہ تاور نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے حسبِ ذیل شرطیں لگائی ہیں۔

(۱) یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جب کہ عورت کو پہلے سے اسکے عینین ہونے کا علم نہ ہو۔ لیکن اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا، تو اسے تفریق کے مطالبے کا حق نہیں۔

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تو اس کو مطالبہ تفریق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۳) تفریق صرف اس صورت میں کرائی جائے گی جب کہ شوہر ایک مرتبہ بھی مباشرت نہ کر سکا ہو۔ ورنہ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں

نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ان شرطوں میں سے کسی کے لئے بھی قرآن اور حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے۔ اور ہم ان تینوں شرطوں کو درست نہیں سمجھتے۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کیسیاتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں ایسی نادان عورت کے لئے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر کے تفریق کر دیا جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا۔ اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی، تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں جس کی بنا پر اس کو تمام عمر مصیبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک نا تجربہ کار دو شیزہ ابتداءً میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے۔ میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی مگر بعد میں اس کو ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں، جن کا اسے پہلے احساس نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جائے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتداءً میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو ستر ستر کر مر جایا کرے۔

یاختہ بن کر زندگی گزار جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہوتے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلیں میں منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے۔ ورنہ اس حالیکہ حقیقتہً تفریق میں اس کا بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جاسکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی میرے نزدیک زیادتی ہے۔ کیونکہ سزا کا مستحق تو وہ شخص ہے جس نے نامرد ہونے کے باوجود نکاح کیا۔

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز لپورا نہیں ہوتا! اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق کیلئے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ بس ایک یا دو چار مرتبہ شوہر کی صحبت سے متمتع ہو جانا ان کے لئے کافی ہو اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ منسی خوشی گزار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر سچا سنی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ سچا سنی صدی عورتوں کا حشر کیا ہو گا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لئے حلال کے دروازے بند کر کے انہیں حرام کے راستوں

پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں نامردی کی ہر شکایت پر خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لئے ایک سال کی مدت مناسب ہے یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کر دینی چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بے جا شدت پائی جاتی ہے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لئے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کر دینی چاہیے۔

فقہاء نے خضی کے لئے بھی وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لئے رکھا گیا ہے یعنی اس کو بھی علاج کے لئے ایک سال کی ہہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خضی اور محبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانبشین، دونوں صورتوں میں وظیفہ زوجیت کے لئے وہ یکساں نا اہل ہوتا ہے اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہذا خضی اور محبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیے۔

۱۱۔ جنون

جنون کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے۔ اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے۔ فقہار نے اسی کو لیا ہے اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس جنون کے لئے ہے، جو نکاح سے قبل جنون تھا اور نکاح کے بعد ہم بستری پر قادر نہ ہوا۔ اس لحاظ سے گویا وہ عین ہے اور اسی لئے اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں جنون اگر حادث ہو تو اس کو علاج کیلئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اور اگر مُطَبِق ہو تو وہ مجتوب کے حکم میں ہے، بلاتا جیل سے تفریق کرادی جاتے گی۔

امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مُطَبِق دونوں میں ایک سال کی مہلت بغرض علاج دی جائے گی اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو، تو تفریق کرادی جائے گی لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسبِ ذیل شرطیں لگاتے ہیں۔
(۱) اگر نکاح سے پہلے جنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح

۱ یعنی جس کے دورے کبھی کبھی پڑتے ہوں۔ ۲ یعنی دائمًا حالت جنون طاری ہے۔

۳ یعنی مہلت دینے بغیر۔

کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ جنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے۔ ان کا کوئی ماخذ کتاب و سنت میں نہیں ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ ثمر نعیت، تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ہو تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے لئے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو درحقیقت اس کے لئے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رہے۔ یہ سزا کیسے اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے ثمر لیا نہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس

کی خبر گیری کی اور سابق کا ساتھ لگنے اور شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا۔ تو اس سے یہ کیوں لازم آجاتے کہ جب اس کا پاگل پن اس بے چاری کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جاتے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں اتنا جنون ہو پیدا ہوں، وہ فوراً اس کی تمام پھیلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت یہ وفاداری و رفاقت بلاتے جان ثابت ہوگی اور اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں مرد کے حقوق کا بہت مبالغہ آمیز تصور اختیار کیا گیا ہے اور دوسری طرف عورتوں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیکار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو، تو مرد اسے طلاق دے سکتا ہے، یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوش گوار طریقہ سے بسر کر سکتا ہے۔ لیکن مرد ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے۔ اس کے لئے بجز تفریق کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارہ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لئے رہائی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اس عدل اور توازن کے خلاف ہوگا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے ایسے تمام

معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لئے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیے۔ عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار اور تعدی نہ ہو اور حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف نہ ہو، لیکن اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تشریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل یا آشک زدہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجز واکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کہ کسی عورت کے لئے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت زبردستی اس حالت میں رکھی گئی ہو، اس کے لئے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کیلئے کس قدر دشوار ہے؟

۱۲۔ مفقود الخیر

مفقود الخیر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَوْلَى الْمَفْقُودِ أُمَّرَاتِهِ
 حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کا حال معلوم

لے ایذا رسانی، تکلیف دہی کے زیادتی

حَتَّىٰ يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ
تہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مُصعب اور محمد بن ثمر جلیل ہمدانی کے واسطے سے پہنچی ہے جو مجروح ہیں ابن ثمر جلیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انا یوردی عن المغیرۃ منا کیر ابا طیل لے اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین ہیں ابن ثمر جلیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے، وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن ثمر جلیل اس حدیث کو مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں کیسے ممکن تھا کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمرؓ و عثمانؓ غنی رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کلیتہً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

لے وہ مغیرہ سے ایسی باتیں روایت کرتا ہے جو منکر اور جھوٹی ہوتی ہیں۔

صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی آراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ
 حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ مفقود
 کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیبؓ، زہریؓ
 نخعیؓ، عطاءؓ، مکحولؓ اور شعبیؓ کی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی مذہب کو اختیار
 کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اس کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الزمیر
 کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس
 کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔ سفیان ثوریؓ، امام ابو حنیفہؓ اور امام شافعیؓ رحمہم
 اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لئے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے
 ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس بستی یا اس کے ملک میں زندہ
 ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے پھر مختلف بزرگوں نے اپنے
 اپنے اندازے کے مطابق انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے کہ ایک
 انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے
 کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود ہو تو اس کی بیوی
 کو بقول بعض ۹۰ سال، اور بقول بعض ۷۰ سال، اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول
 بعض ۵۰ یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ بعض کے نزدیک
 انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں۔ اب اگر اس
 وقت عورت ۲۰ سال کی تھی تو سب سے زیادہ جن بزرگوں نے اس کے ساتھ رعایت
 فرمائی ہے، ان کے فتوے کے مطابق وہ ۶۰ برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کا انتظار

کرے۔ پھر اسے نکاح کی اجازت ہے۔

اس مسئلے میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے فَلَا تَمْلِكُوْا اَكْلَ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیوں کہ پسند کر سکتا ہے؛ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلا کر دو تو زیادہ سے زیادہ چار ہیے تک ایسا کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا۔ یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب بن جائے پھر وَلَا تَهْسِبُوْهُنَّ ضِرَارًا فَرِيًّا گیا جس کا منشا رصاف طور پر یہ ہے کہ رشتہ ازدواج میں ضرر نہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں اتنا درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حد اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتہ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جس عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اس کے لئے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق چھوڑنا درست نہیں ہے۔

۱۳۔ مذہب مالکی کے احکام و باب مفقود

علمائے احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلے میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتوے دینا پسند کیا ہے۔ لہذا اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدانِ زوج کی تین صورتیں ہیں اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں۔

۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دے گا۔ بلکہ تحقیقِ حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیار خود طلاق دے دے گا، یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر آپ طلاق وارد کرے۔ ثنائی اور حنبلی مذاہب بھی اس مسئلے میں مالکی مذہب کی

لئے تطبیق کیلئے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بربہ سے فرمایا تھا کہ أَنْتِ أَمْلِكُ بِنَفْسِكَ إِنْ شِئْتِ أَقْبَتِ مَعَ زَوْجِكَ وَإِنْ شِئْتِ

(ماہ صفر ۱۴۳۳ھ)

تائید کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک عدمِ نفقہ بجائے خود تفریق کے لئے کافی ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جو ان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لئے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جتنی مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوفِ معصیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود منہ چھوڑ کر کہہ دے کہ مجھے اس شوہر کی قیدِ نکاح سے آزاد کر دو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فقدانِ زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے اور دعوائے کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گزار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے اسے مدتِ انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہیے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

(ذبیحہ حاشیہ ص ۱۴۲) قارقیتہ، یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جدا ہو جائے

(الف) اگر مفقود بلا و اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ناممکن ہے تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

(ب) اگر وہ میدان جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

(ج) اگر وہ کسی مقامی فساد کے سلسلے میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اس کی تلاش کے لئے امکانی کوشش کی جائے گی، پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت و فوات گزارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

(د) اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان بھی نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مدتِ تعمیر گزارنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدتِ تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۸۰ سال اور بعض ۷۵ سال۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علمائے احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرطوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدانِ زوج کی تمام صورتوں میں چار سال تک انتظار کا فتوے دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے، خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات

۱۔ یعنی ایک اوسط درجہ کے انسان کا جنسی عمر پانچا متوقع ہو۔

کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں، ہر فاقد الزوج عورت کے لئے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالحِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست ڈسپین باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ غیر اسلامی طریقوں کے رواج نے اُن تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہواتِ نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے اسلام نے قائم کی تھیں۔ عریاں تصاویر ہیں، عشقیہ ناول اور قصے ہیں، ریڈیو کے جنون خیز گانے ہیں جن سے کوئی شخص شہریں اور قصبوں میں رہتے ہوئے بچ ہی نہیں سکتا۔ اور ان سب پر مزید یہ کہ قانون ملکی نے زنا کو جائز کر رکھا ہے پھر پردے کے شرعی حدود عملاً باقی نہ رہنے کی وجہ سے غیر محرم مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے ضبطِ نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہو گا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخیر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے؟ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لئے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج ساری قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخیر کے متعلق مذہبِ مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجراءِ احکام میں فاقد الزوج عورت کی عمر، اس کے ماحول اور اُس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو حالتِ انتظار میں گزارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

۱۴۔ حکم بھرت واپسی منفقو

اس سلسلے میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر منفقو عدالت کی دی ہوئی مدت انتظار ختم ہو جانے کے بعد واپس آجائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اسی کو ملے گی لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا مفتی بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید برآں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو ہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالک نے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رجوع ثابت نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو پھر شوہر اول واپس آجائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیے یا نہیں؟ اگر اس نے ہر واپس لینے یا معاف کر لینے کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گزارنی ہوگی۔ پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی اور

دوسرے شوہر سے اس کو مہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہی سب سے بہتر ہے جس سے امام مالک نے استناد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورت کا نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق اس پر قائم رہے تو کون ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چین چلے بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ بر باد ہو؟ اس قسم کی شرائط عائد کرنے میں عورت کے لئے غایت درجے کا ضرر ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک طویل اور تمھکا دینے والی مدت انتظار گزار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پیر وادہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے، اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گزارنی پڑے۔

۱۵۔ لِعَان

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں لِعَان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا: - اللَّهُ أَعْلَمُ أَنَّ أَحَدًا كَذِبٌ فَهَلْ مِنْكُمْ مَن تَأْتِيهِ - اللہ

خوب جانتا ہے، کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟" جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا، تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا گیا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت، پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا۔ ذَاكُمُ التَّفْرِيقُ بَيْنَ كُلِّ مَثَلًا عَيْنِ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِذَا تَفَرَّقَا لَا يَجْتَمِعَانِ اَبَدًا۔ یہ ہے تفریق کا طریقہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لئے۔ اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلویا جائے۔ آپ نے جواب دیا۔ لَا مَالَ لَكَ اِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا فَبِمَ اسْتَحَللتَ مِنْ فَرْجِهَا وَاِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ ^{عَلَيْهَا} فَذَلِكَ اَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا۔ "مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔"

حضورؐ کے اس فیصلہ سے حسبِ ذیل احکام نکلتے ہیں۔

- ۱۔ لعانِ قاضی کے سامنے ہونا چاہیے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔
- ۲۔ لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی

ایک قصور کا اعتراف کر لے۔ جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لیعان کرایا جائے۔

۳۔ فریقین کی طرف سے لیعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کرے گا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی گئی ہے۔ جہور کا خیال یہ ہے کہ لیعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے ہے کہ تفریق کے لئے حکم حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لیعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا اعلان فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے محض ملامت کو فرقت کے لئے کافی نہیں سمجھا۔

۴۔ لیعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون بھی جاری نہیں ہوتا جو حتیٰ تَنْكِحَ زَوْجًا خَيْرًا میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ لیعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر وہ چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لیعان کرنے سے انکار کرے تو جہور کی رائے میں اس پر حدِ ذوق جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لیعان کر چکنے کے بعد عورت لیعان سے انکار کرے تو شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اس کو رجم کیا جائیگا،

اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس کو قید کیا جائیگا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کا جرم مستلزم ہمز اقرار دیا جاسکے، اس لئے سہ دست ضابطہ شرعی میں اس کے لئے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اسے ہر سے محروم کر دیا جائے۔ یہ صرف اس وقت تک ہونا چاہیے جب تک ہم پر ایک غیر مسلم حکومت مسلط ہے اور ہم خود اپنے قوانین تعزیرات جاری کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۱۶۔ تطایق تینہ در مجلس واحدہ

بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صحیحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقات ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق متعلقہ کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقات دیں تو

اسے ایک ہی وقت میں تین طلاقات دے کر عورت کو جدا کر دینا۔

حنفور غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ ایلْعَب بِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ
 اَنْظُرِيْكُمْ کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے
 درمیان موجود ہوں؟ بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حنفور نے اس فعل
 کو منصبت فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص
 ان کے پاس مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو در سے لگاتے تھے۔
 اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی
 بیویوں کو جھٹے تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش
 کرتے پھرتے ہیں، کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرنے
 کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو معنی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات
 باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے
 گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے
 کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جد کر دینے پر ایسی پابندیاں
 عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر
 اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی
 گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے اور ہرجانہ کی مقدار
 کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی
 روک تھام کی نکل سکتی ہیں۔ جن کو ہمارے علماء و ماہرین قانون غور و خوض کے بعد
 تجویز کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مسئلے کو کثرت سے لوگوں میں شائع کرنے

کی ضرورت ہے کہ یہ فعل ناجائز ہے تاکہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں۔

خاتمہ کلام

اس رسالہ میں اسلامی قانونِ ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانانِ ہند کے لیے مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لیے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہ قبول کر لیا جائے۔ انسانی راتے میں بہر حال خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی راتے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحی خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانونِ ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہل علم اور اصحابِ فکر و رائے کا کام ہے کہ وسعتِ نظر اور کتاب و سنت میں تدبیر سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں۔ اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو

محض اس نیا پرزور نہ کر دیں کہ لکھنے والا بدقسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسوداتِ قانون کے متعلق بھی مجملاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلے میں حیدرآباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودات تشنہ اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے غیر مکلفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جاسکتا جو اینگلو محمدن لاء کے تقاضا اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا بعض مسائل میں جزیئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکامِ عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو قوانینِ شریعت اور مذاہبِ فقہیہ کے جزیئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمدن لاء کی سپرٹ مسلط ہے۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لیے ایک مفصل ضابطہ مدون کیا جائے جیسا کہ ہم اس رسالہ کے گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کام

لے یہاں ان مسودوں کے محض نفسِ مضمون سے بحث ہے اس سے بحث نہیں کہ آیا مجالسِ قانون ساز کو بجائے خود کوئی "اسلامی قانون" پاس کرنے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے جو قانون یہ پاس کریں، خواہ وہ لفظ بلفظ شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، بہر حال وہ شرعی قانون نہیں ہو سکتا۔

آسان نہیں ہے، وقت اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں ہے اس کے لیے اصحابِ علم و رائے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں سے جزییات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ اُمت کے اربابِ حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانینِ شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔

ضمیمہ نمبر ۱

ایک نہایت اہم استفتاء

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتاء بھیجا ہے جس کا موضوع بجا تے خود نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ذیل میں استفتاء اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے۔

ماہرین علوم اسلامیہ و مفتیان شرع متین سے حسب ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے۔

۱۔ اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنج مسلمان مرد و عورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کر دے، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنج عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دیدے، جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نکاح فسخ ہو جائے گا، اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور عورت کو شرعیاً یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور نیکاح طلاق کو شرعیاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو، دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے؟

(۲) اگر سوال مذکورہ الصدر کا جواب نفی میں ہو یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم نسخ نکاح اور ایقاع طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور غیر مسلم کے نسخ نکاح یا ایقاع طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اول کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے گی، اور اس دوسرے مرد کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے ذریعے سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہو گا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا حرام ہو گا یا نہیں؟ اور دونوں شرعاً زنا کے ترکیب سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

(۳) اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہوگی تو وہ ولد الحرام ہوگی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہوگی یا نہیں؟

مہربانی فرما کر ان سوالوں کے جواب نمبر وارہ لے کر تحریر فرمائیے۔ الخ
اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اس کو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف نسخ و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان معاملات کی نوعیت دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق کے معاملات میں نہیں، بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رو سے غیر مستحکم ہے۔ اسلام نہ اس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک، یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قاعلم ہوتی ہو، نہ اس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اس عدالت کے حق سماعت و فصل خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اس کی اجازت (Sanction) کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رو سے ان عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "ناج" کی اجازت کے بغیر قاعلم کی جاتی ہیں۔ ان عدالتوں کے جج، ان کے کارندے اور وکیل، اور ان سے فیصلہ کرنے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو بادشاہ ارض و سما کی مملکت میں اس کے "سلطان" (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو، اور جس میں اس کے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ ایسا نظام عدالت مجرم مجسم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے مجرم ہیں اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے، کیونکہ بغاوت اس کی جڑ میں موجود ہے۔ بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں، تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور اور زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہوں

گے اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہوں گی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کیے جو خدا کے قانون کی رو سے ان کو حاصل نہ تھے۔

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہ قائم رہتی ہے جبکہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان ان کی کرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لے کر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسان کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے احکام جاری کرتا ہے، وہ کم از کم بیچ کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر مجھلا اس کے احکام کا عدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جب کہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں، خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں تلیل التعداد ہوں یا

لے اس سلسلے میں ان مقدمات کی کارروائی مزید بصیرت کی موجب ہوگی جو ۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حکومت ہند نے ان فوجی افسروں پر چلائے، جنہوں نے بریاد ملا یا پر جاپانی قبضے کے دوران میں "آزاد ہند ریاست" اور "آزاد ہند فوج بنالی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں کے مقدمہ میں ہندوستان کے ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ کی جو تقریر کی تھی وہ بغور پڑھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ اس میں ان نام نہاد باغیوں کے مقابلہ میں حکومت ہند کی جو قانونی پوزیشن بیان کی گئی تھی، درحقیقت وہی تمام اصلی و حقیقی باغیوں کے مقابلہ میں سلطنت رب العالمین کی قانونی پوزیشن ہے۔ (یہ حاشیہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے)

کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری لادینی اصول پر نظام حکومت قائم کیا ہو۔ بہر حال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر ہو کہ اہل ملک خود مالک الملک (Sovereign) ہیں اور ان کو قانون الہی سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے، اس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اس کے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کر لے۔ جس طرح ایسی حکومت کو اس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کر سکتا اسی طرح اس نوعیت کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہوں گی، خواہ ان کے حج تومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کے فیصلے بھی اسی طرح کالعدم ہوں گے، جس طرح کہ صورت اول و دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا اس کی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم چونکہ سائل نے کتاب و سنت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے محض چند آیات قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے۔ لہذا فطرۃ امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔

۱۔ آیہ کہ کوئی اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت اختیار کرے اس کے قانون شرعی کے مطابق حکمرانی اور فیصلہ کرے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

کہو اے اللہ، مالک الملک، توحس کو
چاہے ملک دے اور جس سے چاہے
چھین لے۔
وہ ہے (اللہ) تمہارا رب، مالک اسی
کا ہے۔

بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں
(Partner) ہے۔

لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کے لیے
خاص ہے۔

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصّہ دار
نہیں بناتا۔

خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی
کا ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں سہارا بھی کچھ
حصّہ ہے؟ کہہ دو کہہ امر سارا کا سارا اللہ
کے لیے مخصوص ہے۔

(۲) اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکل سلب

کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، بندہ اور محکوم ہے اور اس کا
کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے اس کے
(حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ
تُوْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِيْعِ
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَآلِ عِمْرَانَ - (۲۶)
ذُ لِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَدَا
الْمَلِكِ (فاطر - ۱۳)

لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي
الْمُلْكِ (بنی اسرائیل - ۱۱۳)

فَاخْكُمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ
(المومن - ۱۲)

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ
اَحَدًا (الکاف - ۳۶)

اَلَا لَهٗ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ -
(اعراف - ۵۴)

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ -
(آل عمران - ۱۵۴)

قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کو قی قانون بناتا ہے، یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ طاغوت سے، باغی اور خارج از اطاعت حق ہے۔ اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلے پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ
أَلْسِنَتَكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ
وَهَذَا حَرَامٌ۔

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے (Lawful)

اور یہ حرام (Un-lawful)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ
رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ
أَوْلِيَاءَ

سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھہرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔

(اعراف - ۳)

لہ قانون الہی کی حدود کے اندر تنبیط و اجتہاد سے تفصیلاً فقہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے جو یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں روح شریعت اور مزاج اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے کیونکہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنے کا قانونی حق اہل ایمان کو دے دیا گیا ہے۔

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے
جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام
لوگ کافر ہیں۔

اسے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو
جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان
لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری
گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا
فیصلہ طاغوت سے کر لیں۔ حالانکہ انہیں حکم
دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس

کے حکم کو تسلیم نہ کریں)

(۳) خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور صحیح عدالت صرف وہ ہے جو اس
قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اسی
کا نام خلافت ہے۔

اور ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا
ہے کہ حکم الہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔
اسے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق
نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس
روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے
تمہیں دکھائی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يُجِبْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔
(المائدہ - ۲۴)

الْمُتَدْرِئِ إِلَى الَّذِينَ
يَدْعُونَ أَنَّهُمُ آمَنُوا بِمَا أَنْزَلَ
إِلَيْكَ وَمَا أَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيدُونَ أَن يُتَّخَذَ كُفْرًا إِلَى
الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا
بِهِ۔

(النساء - ۶۰)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء - ۶۴)
إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا
أَرَاكَ اللَّهُ۔

(النساء - ۱۵)

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
وَأخْذُ رُءُوسِهِمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ
بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ
أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ
(المائدہ - ۵ - ۴۹ - ۵۰)

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس
ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور
ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو
کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت
کے کسی جز سے نہ پھیریں جو اللہ نے تمہاری
طرف نازل کی ہے.... کیا یہ لوگ جاہلیت
کی حکومت چاہتے ہیں؟

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً
فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ
فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ
(ص ۲۶)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ مقرر
کیا ہے لہذا تم حق کیساتھ لوگوں کے درمیان
حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی
نہ کرو۔ ورنہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو
بھٹکا لے جائے گی۔

(۴) اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم
کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر
تائم ہو، بلا لحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں کتنی
ہی مختلف ہوں، ان کے تمام افعال بے اصل اور باطل ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ
کے لئے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں
سلطان Charter عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح
ہو سکتی ہیں۔ وہ تو جو کچھ کہتی ہیں، خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کا عدم
لے پار ہے۔ بہاری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپ کو (باقی صفحہ ۱۶۵ پر)

ہے۔ اہل ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) ان کے وجود کو بطور ایک خارجی واقعہ کے تسلیم کر سکتے ہیں، مگر بطور ایک جائز وسیلہ انتظام و فصلِ قضایا کے تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا — اللہ — کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے اور جو ایسا کریں وہ اوعائے اسلام ایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت ایک گروہ کو باغی قرار دے اور پھر اپنی رعایا پر ان باغیوں کے اقتدار کو جائز بھی تسلیم کرے، اور اپنی رعایا کو ان کا حکم ماننے کی اجازت دیدے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَّهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنََّّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا - أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَبُخِّلَتْ أَعْمَالُهم فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزَنًا

(الكهف-۱۰۵)

و تفسیر حاشیہ ص ۱۶۴) اس کا خلیفہ (نذکرہ خود مختار) تسلیم کرے، پیغمبر کو اس کا پیغمبر اور کتاب کو اس کی کتاب مانے، اور شریعتِ الہی کے تحت رہ کر کام کرنا قبول کرے، صرف ایسی ہی حکومت اور عدالت کو خداوند عالم کا چارٹر حاصل ہے۔ یہ چارٹر خود قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ اَحْكُمْ بَيْنَهُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ لِرُءُوٰسِ الْاُمَمِ (۱۶۴) اور یہی حکومت کو اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے

» اے نبی! ان سے کہو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود، رخصتے الہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی) اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی طاقات (اس کے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اس لئے ان کے سب احکام ضبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

یہ عادی جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمن حق کے امر کا اتباع کیا۔

قَلْبَكَ عَادٌ جَبَدٌ وَإِبَائِي
رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلًا
وَاتَّبَعُوا أَمْرًا كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ -
(ہود - ۵۹)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح روشن سلطان کیسا تھ فرعون اور اس کے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے ہمارے فرستادہ شخص کے بجائے فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا)۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا
وَسُلْطَنٍ مُّبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
وَمَلَائِكِهِ - فَاتَّبَعُوا أَمْرًا فِرْعَوْنَ
وَمَا أَمْرٌ فِرْعَوْنَ بِشَيْءٍ -
(ہود - ۹۶ - ۹۷)

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو

وَلَا تَطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنَّا

ہم اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اس کے رب ہیں) غافل کہہ رہے ہیں جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جبکہ امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کلام کو خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو، اور حق کے بغیر اکیڈ و سرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت) یا الوہیت میں ان کو شریک کر دو جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لئے خاص ہے اسکا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے درآنحالیکہ راہ راست اس پر واضح ہو گئی اور ایمان داروں کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدہر وہ خود مڑ گیا اور

زِكُونًا وَ اتَّبَعَ هُوَ لَهُ وَ كَانَ
أَمْرًا قُرْطًا

(الکھف - ۲۸)

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ
وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ
تُشْرِكُوا بِإِلَهِ اللَّهِ مَا لَهُ يَنْزِلُ
بِهِ سُلْطَانًا

(اعراف - ۳۲)

وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ
إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ
مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ
إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا
إِلَّا آيَاتُهُ - (يوسف - ۲۰)

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَ
يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ
لَا نُؤْتِيهِمْ مَّا تَوَلَّوْا وَ نُضَلِّهِمْ جَهَنَّمَ

وَسَاءَتْ مَصِيْرًا -

(النساء - ۱۱۵)

اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی
بمراٹھ کاٹا ہے۔

فَلَا دَرِيْبَكَ لَا يُؤْمِنُونَ
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ
بَيْنَهُمْ - (النساء - ۶۵)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے
جب تک کہ اے نبی تجھ کو اپنے باہمی اختلافات
میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى
مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُورًا

(النساء - ۶۱)

اور جب کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے
آنا رہا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے
منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے چھڑک رہے
ہیں۔

وَلَنْ يُجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا -

(النساء - ۱۲۱)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے
باغیوں) کیلئے الہ ایمان (یعنی اپنی وفادار عیال)
پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے حکمت ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے اسلام کے نظام
اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر مشتبہ رہ جاتا تو
قرآن کا نزول ہی معاذ اللہ بیکار ہوتا۔ اس لئے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور
قطعی طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں دو راہیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے
اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔
پھر جب کہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ
نے جس چیز کے لئے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے، اور اللہ کے سلطان

سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اس کی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملہ میں بھی کسی غیر الہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اس کے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ ختنہ سیریب پورا کا پورا حرام ہے تو اس کی کسی بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں؟ پس یہ سوال کرنا کہ فسخ نکاح، اور تفریق بین الزوجین، اور ایقاعِ نفاق کے بارے میں غیر الہی عدالتوں کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم جموں کے بارے میں کیا جاتے۔ گویا سوال کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الہی نظام عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں ان کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا، حالانکہ ختنہ سیریب کے جسم کی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لئے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم تو نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان اگر غیر الہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے یا بالفاظِ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں اس سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام

کو چھوڑ کر کسی آسان طریقِ زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ایسے جیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔

(ترجمان القرآن - اگست ۱۹۴۰ء)

ضمیمہ نمبر ۲

یورپ کے قوانین طلاق و تفریق

(تَعْرِيفُ الْأَشْيَاءِ بِأَصْدَادِهَا) اسلامی قانون ازواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شانِ کمال کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے مقابلہ میں دنیا کے ان قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جیب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیش نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا

کے چیزیں اپنی نند سے پہچانی جاتی ہیں۔

کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ان سب کا اسلام میں، نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب تیلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف زمانوں میں مختلف تمدنی حالات اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعی بلیغ، اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے لازمی اقتیادت اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال مستقبل پر یکساں نظر رکھے، بالفعل اور بالقوۃ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام بنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل و مناسبت کیساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا، کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے، کہیں اشخاص کے حقوق

اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں فرد اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے، غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا منسوخ رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شہرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کئے جاتے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا، وہی صحیح تھا۔ اس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے، وہ سب غلط اور ناقابل اتباع نکلے۔ اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے اور اب بھی اب بھی ان کی ناکامی کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دنیا ان قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھتی تھی، اور آہستہ آہستہ ان اصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کئے تھے، لیکر بعد از خرابی بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے کو لے لیجئے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی، اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جو اب بن نہ آتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ از دو واج

کے مقدس رشتے کو ناقابل القطار قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع و فسخ و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمون تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ :-

”جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے“ (متی ۱۹: ۷)

مگر مسیحیوں نے نبی کے اس قول کا منشا نہ سمجھا اور اسے اخلاقی ہدایت کے بجائے قانون ازدواج کی اساس بنا لیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابل عمل قانون کے خلاف جیلوں اور بکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ پھر خلاف ورزی قانون کی عادت بدلنے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں۔ جسے غلطی سے وہ خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اس وقت اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پروان چڑھی اور دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی کسی چیز کا بھی احترام باقی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں کی بدولت مسیحی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان اُٹھ آیا، جس کی شدت سے خاندانی نظام کی ”مقدس“ دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۷۱ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۲۳ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۷ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۳۵ ہزار

تفریقیں ہوتی تھیں، وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کر لئے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ۵۵ شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق پر پہنچ رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اسی سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ۔
 الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ رَأَيْتَهُمْ لَمَّا كَانَتْ إِلَيْهِمْ
 أَنْ يُؤْتُوا مَا وَعَدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ أَنْ يَتَّقُوا لَيْسُوا إِلَّا جُنُودًا كَانَتْ هُمْ
 أَنْ يُؤْتُوا مَا وَعَدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ أَنْ يَتَّقُوا لَيْسُوا إِلَّا جُنُودًا كَانَتْ هُمْ
 الْمُنَافِقِينَ (البقرہ ص ۲۷)

مسیح نے یہودیوں کی "سمت دلی" اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کہا تھا کہ :-

”جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔“ (متی ۱۹: ۷)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی غرض کے لئے اس سے زیادہ سچے نئے الفاظ میں طلاق کو اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھہرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص کی تعلیم کے لئے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انہی کو مجسّم لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلّم اخلاق ہی نہ تھے، بلکہ صاحبِ ثمرِ بعیت بھی تھے۔ اس لئے آپ نے اصولِ اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں

لے جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصول اخلاق و مقتضیات فطرت انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بھلا اس کے مسیح علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے بلکہ اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا اس لئے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر ان اصولوں کا صحیح الطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھے اور سینٹ پال نے ان کو یہ سمجھایا کہ اصولوں کو پالنے کے بعد اب ہم الہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ "چرتھ" کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر خود قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرتھ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لئے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصول دین بتائے تھے، ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرتھ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی تو ہیں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مسیح نے طلاق کی جو بُرائی کی تھی، اس میں "حرام کاری" کا استہنا کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مُطلقاً بُری چیز نہیں بلکہ سببِ جائز کے بغیر مبعوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اسے اوپر والی آیت "جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے" سے متعارض سمجھ کر بعض

لے جائز کاموں میں سب سے زیادہ بُرا کام

تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق تو کرادی جائے مگر رشتہ نکاح بدستور قائم رہے" یعنی دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی۔ منجملہ دوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بد اخلاقی کے رواج کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔

حکومت یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ارادہ کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial Separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے مگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔ کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Cannon Law) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتہ نکاح کا کامل انقطاع، جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہوتا تھا ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لئے چھ صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری (۲) نامردی (۳) ظالمانہ برتاؤ (۴) کفر (۵) ارتداد (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔ ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارہ کار تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ کون صاحب عقل اس چارہ کار کو مطابق عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارہ کار نہ تھا۔ بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لڑک تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لیجاتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ اور اگر کسی قضا کے مارے ہوئے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی، تو اسے لاچار
 رہوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔
 اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لئے مسیحی علماء نے بہت سے شرعی
 جیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر ”چرتھ“ کا قانون ایسے بد نصیب زوجین کا نکاح
 نسخ کر دیتا تھا۔ منجملہ ان کے ایک جیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے، کہ زوجین
 نے مدت العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا، وہ بلا ارادہ ان سے سرزد ہو گیا تھا، ورنہ راصل
 ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لئے رشتہ ازدواج میں منسک ہونا تھا، یعنی
 مستعداً تو اس صورت میں مذہبی عدالت نسخ نکاح، یا بالفاظ صحیح تر بطلان نکاح Nullity
 کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رو سے ”بطلان نکاح“ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین
 میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان
 سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارہ کار پہلے سے
 بھی ذلیل تر تھا۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church) نے،
 جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں، نسبتاً ایک بہتر
 اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بند نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ
 کی بنا پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زنا اور اس کے مقدمات (۲) ازداد (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو تیس کی
 حیثیت سے مذہبی خدمت کے لئے وقف کرنا (۴) بغاوت زدہ، نشوز (۶) نامردی
 (۷) جنون (۸) برص و جذام (۹) بلویل مدت کے لئے قید ہونا (۱۰) نفرت باہمی یا شدید

توافقیت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے وہ کلیسا سے روم کی فتنہ پر ایمان لائے چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتہ نکاح بجز عورت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لئے عقل سے کام لینا تو دور کننا خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔

۱۹۱۲ء کے رائل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop Gore) نے مشرقی کلیسا کی فتنہ سے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی تہذیب

رومن کلیسا کی فتنہ کا مندر ہے۔ ۱۹۳۰ء کی لمبیجہ کانفرنس (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح نہیں پڑھ سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراضِ جنسیہ میں مبتلا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو نہ عورت کے لئے مذہبی حیثیت سے کوئی چارہ کار ہے نہ مرد کے لیے۔

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک بڑے بڑے علماء اور فقہا پیدا ہوئے مگر اب تہذیب ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہو گئی تھی اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتداد زمانہ بغیر حوالہ علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ

مہینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے، اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر،
غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں اور ہزار برس کی
طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست
کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر ان روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے دانشمندیوں
قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجئے جنہوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد
ہو کر اپنی قوموں کے لئے خود اپنے علم کے بل بوتے پر آزاد و اجنبی قوانین بنائے ہیں۔
انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا
مذہبی قانون نافذ تھا اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی
معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی
دور میں جب آزادی، تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس
قانون کے اٹھائیس کو محسوس کیا، اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر
آمادہ نہیں کیے جاسکتے۔ سرے سے اس کا جو اہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ^{۱۷۹۲ء}
اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا،
ہیلم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سویٹزر لینڈ وغیرہ نے بھی مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے
اپنے جداگانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لئے جن میں قانونی تفریق اور فسح کے علاوہ
طلاق کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہونا براہ راست
نتیجہ ہے اس ننگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علماء ایک ناقابل عمل خلاف

فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مستطرد رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا، محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا۔ لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابلِ ترمیم قرار دیا۔ انہوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلاتِ عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا، محض اس لئے کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے جتنی کہ انہوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ ”ہم مغربی چرچ کے مقلد ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرزِ عمل نے مغربی قوموں کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار باقی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابلِ اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔“

ایک قانونِ ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے، دراصل یہی پاریمانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لاندہی کی طرف دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔ مذہبی قانون سے آزاد ہو جانے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جو ازدواجی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور تجربات کی روشنی میں پے درپے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک اتمی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو ان تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انہیں رومن چرچ کے ابتدائی بائبلوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو جیسے ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ، دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوں، اُس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورہ بالا دو وجوہ کے ساتھ ایلا اور باغٹارغ تعلق زن و شو

(Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا، بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدہ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مرد عدالت سے رجوع کرے، بطور خود وہ طلاق نہیں دے سکتا اور اسی طرح عورت کے لیے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ

بہر حال میں اسے بھی عدالت سے ہی رجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لئے طلاق کی ڈگری دینے کی صورت ایک ہی صورت رکھی گئی، اور وہ یہ کہ اگر مرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکب زنا ہونا ثابت کرے اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاب زنا اور اس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ یا نشوز کا بھی ثبوت دے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہر حال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام مزور لگانا پڑے گا اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو افسردہ بنا دینا۔

ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا۔ عدالتوں کو سوتیلی کے تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالت ہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت کو پابد اخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید برآں اس قانون نے شوہروں کو ریوٹی کی بھی تعلیم دی، کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ ہرجانہ یعنی بیوی کی عصمت کا معاوضہ!! تنبیہ ناجائز کی قیمت، جو قرضاتوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!!!

۱۸۸۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو زناح توڑنے کے ساتھ ساتھ خطا کار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ ۱۹۱۴ء کے قانون میں شوہر کے خطا کار ہونے کی شرط اڑا دی گئی اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری ڈال دے یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا، درانحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبنی برانصاف کہا جاسکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے، اور اس سے الگ رہے، تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی، اور اسے نفقہ دلوائے گی، اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے برے برتاؤ یا تعاقب کے سبب زنا کی ترکیب ہو تو اس کے خلاف تلاق

کے لئے شوہر کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہو گا۔ ذرا اس کے معنی پر غور کیجئے۔ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا رہے، شوہر کو پاس نہ پھینکنے والے، خزانچ کے لئے روپیہ اس سے لے اور زندگی کا لطف دوستوں سے اٹھانے، پھر اگر شوہر ایسی عورت سے چھپا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے درپے محنتوں سے مرتب کیا تھا۔

۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ اسبابِ طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسبِ ذیل اضافہ تجویز کیا گیا:۔

تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابلِ علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گزر چکے ہوں۔ شرابی پن کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید

لے شرابی پن کے معنی مغربی اصطلاح میں عاڈہ شراب پینے کے نہیں ہیں بلکہ حد سے زیادہ شراب پی کر عتدہ لینے اور وہم چمانے اور ریپٹ، گالم گلوتج اور برسر بازار بیہودگیاں کرنے کے ہیں۔

کی سزا جو سزائے موت سے معاف کر کے دی گئی ہو۔

(۳) شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لئے زوجین میں تفریق کرائی جائے اور اگر اس

مدت میں یہ لیت نہ چھوڑے تو ہزر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراضِ خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور

وہ دوسرے فریق سے چھپا یا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو

فسخ نکاح کے لئے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدماتِ طلاق کی رپورٹیں دورانِ مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں

عدالت روواو کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو، جو سب سے زیادہ نامعقول تھی، قبول کر کے

۱۹۲۲ء کے قانونِ معاملاتِ ازدواج (Matrimonial Cases Act) میں

شائع کیا گیا۔ باقی ختبی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں

دی گئی ہے کیونکہ کنٹری کے اُسقفِ اعظم اور بعض دوسرے بااثر لوگ ان سے اختلاف

رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تنقہ کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ عورت

اور مرد کے ارتکابِ زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس غلط

قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں

کی اتنی کثرت ہو گئی کہ انگلستان کی عدالتیں ان سے پریشان ہو گئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ

مری ویل (Lord Merrivale) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے، وہاں اب تک رشتہ

نکاح ناقابل انقطاع ہے، البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد زوجین نہ مل سکتے ہیں، مانہ آزاد ہو کر نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ امر لینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب فرارزویکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napolian) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء اور ۱۹۰۴ء اور ۱۹۲۴ء میں اس کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لئے حسبِ نسل وجوہ قرار دیئے گئے ہیں۔

زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، احد الزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے اس کے ساتھی کی عزت پر حروف آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجبِ ذلت ہو۔

علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کبھی تین سو دن کی عدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے۔

لے عدت کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک مرد سے الگ ہونے کے بعد اور دوسرے مرد کی زوجیت میں جانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیا جائے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے اسلام بالکل فطری صورت اختیار کی ہے کہ تین مرتبہ حیض آنے سے اس امر کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ یہ وضع حمل طلاق کے دس دن بعد ہو جائے اس کے مقابلہ میں ۳ سو دن یا ۱۰ مہینے کی عدت کے لئے کوئی فطری بنیاد نہیں ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ مگر نائٹس اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔

آسٹریلیا، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔

جرمنی میں زبردستی میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلقی ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں تا وقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانون ایلام کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس کے لئے تین سال کی مدت ہے اور ہالینڈ میں پانچ سال کی دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔ مغربی الجزائر کے لئے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں ۸ سال۔ دوسرے ممالک کے قوانین مغربی الجزائر کے باب میں خاموش ہیں۔

مجنون کے لئے جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے۔ باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ بلجیم میں مطلقہ کے لئے دس ہینے کی مدت ہے۔ فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کی مدت مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریلیا میں اُحد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوتی طلاق کے لئے کافی ہے۔ بلجیم میں جب سزا یا بے ہونا عورت یا مرد کو اپنے فینق کھنڈاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لئے جس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان دونوں سے تو نہیں ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھے جاتی ہیں۔ مگر

ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے مقابلہ میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سدباب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ حاوی ہونے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اس کا عشرِ عشر بھی مغرب کی ترقی کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلماندوں نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادشاہ پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی جماعتِ ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا، مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایتِ الہی کی ضرورت سے انکار کئے چلا جائے اور اپنا ہادی و شارع خود ہی بننے

پراصرار کرتا رہے۔ تو بجز اس کے کہ اس کی اس ضد کو حماقت کہا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر احمق کون ہوگا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہنما سیدھا راستہ بتانے کے لئے موجود ہو۔ مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا، اور اس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔

(ترجمان القرآن - جون جولائی، اگست ۱۹۴۱ء)

مطبوعات

ادارة ترجمان القرآن

خطبات حقائق و حقیقت اسلام	●	تفہیم القرآن	●
خطبات حضور و حقیقت مہم و	●	پارہ اول	●
خطبات حضور و حقیقت زکوٰۃ	●	سورۃ النور	●
خطبات حنیفہ پر و حقیقت	●	سورۃ لقمان	●
خطبات حنیفہ پر و حقیقت	●	سورۃ الاحزاب	●
الجهاد فی الاسلام	●	سورۃ نیس	●
حقوق الزوجین	●	سورۃ الفتح	●
خلافت و ملکیت	●	سورۃ الحجرات	●
سلاجقتہ	●	سورۃ الرحمن	●
دکن کی سیاسی تاریخ	●	قیسراں پارہ	●

ادارة ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

ادارة ترجمان القرآن

مطبوعات

ادارة ترجمان القرآن

خطبات حقائق و حقیقت اسلام	●	تفہیم القرآن	●
خطبات حضور و حقیقت مہم و	●	پارہ اول	●
خطبات حضور و حقیقت زکوٰۃ	●	سورۃ النور	●
خطبات حنیفہ پر و حقیقت	●	سورۃ لقمان	●
خطبات حنیفہ پر و حقیقت	●	سورۃ الاحزاب	●
ابہاد فی الاسلام	●	سورۃ نیس	●
حقوق الزوجین	●	سورۃ الفتح	●
خلافت و ملکیت	●	سورۃ الحجرات	●
سلاجقتہ	●	سورۃ الرحمن	●
دکن کی سیاسی تاریخ	●	قیسواں پارہ	●

ادارة ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

ادارة ترجمان القرآن